تین ننھے سُراغ رساں
چیختی وادی میں

تین ننھے سُراغ رساں

چیختی وادی میں

سلیم احمد صدیقی

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

چیخنے والی وادی

”آآآآآآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔اووووو۔۔۔۔۔۔اوووہہہہہہ!“

سیاہ وادی میں اگرچہ ابھی سورج کی آخری کرنیں موجود تھیں، پھر بھی اس عجیب و غریب چیخ نے وادی میں ایک پُراسرار سا ماحول پیدا کر دیا۔ عنبر، نسیم اور عاقِب سیاہ وادی کے پہلے سِرے پر ایک اُونچی چٹان پر کھڑے تھے۔ یہ وادی سمندر کے قریب ہی تھی۔

”یہ ہے وہ چیخ کی سی آواز۔“ نسیم نے عنبر اور عاقِب کو بتایا۔ ”جو یہاں

پچھلے کچھ دِنوں سے سُنی جا رہی ہے۔ کبھی بند ہو جاتی ہے، کبھی آنے لگتی ہے لیکن عموماً کسی خاص وقت پر نہیں آتی اور بعض دِن آتی ہی نہیں۔ آج پھر۔۔۔۔۔" نسیم کی بات پوری نہ ہو سکی کیوں کہ وادی میں پھر ایک بار وہی چیخ کی آواز گونجی۔ "آآآآآآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔ اووووو۔۔۔۔۔۔ اووووہہہہہہ!"

نسیم نے ایک زور دار جھُرجھُری لی اور وہ جھپٹ کر عنبر اور عاقِب کے نزدیک ہو گیا۔ "میرا خیال ہے کہ ڈیری فارم میں کام کرنے والے لوگ اگر اس آواز کو سُن کر بھاگتے جا رہے ہیں تو تعجّب کی کوئی بات نہیں۔ میرا خود بھی جی چاہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔"

عنبر آواز پر غور کر رہا تھا۔ اس نے نسیم کی بات پر کوئی جواب نہ دیا۔ البتّہ عاقِب نے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ آواز اس روشنی کے مینار سے آ رہی ہو جو ہم نے راستے میں دیکھا تھا۔ یا اُس ہارن کی گونج ہو جو سمندری جہازوں کو دُھند سے خبر دار کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے۔"

عنبر اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا، لیکن اس نے عاقِب کی بات سُن لی اور بولا۔ ”اونہوں! نہ تو اس آواز کا روشنی کے مینار سے کوئی تعلّق ہے اور نہ یہ ہارن کی گونج ہے۔“

”کیا تمہیں مکمّل یقین ہے کہ۔۔۔۔“ نسیم نے پوچھا۔

”ہاں، سو فی صدی۔ میری بات کے سچّا ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو اِس آواز کی سمت روشنی کے مینار کی سمت سے مختلف ہے، اور دوسرے یہ کہ آج دُھند بالکل نہیں، اس لیے اس کا تعلّق دُھند سے خبردار کرنے والے ہارن سے نہیں ہو سکتا۔“ عنبر سمجھاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر اس آواز کا تعلّق کس۔۔۔۔۔“ عاقِب نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ حیرت سے اُس کا مُنہ کھلا کا کھُلا رہ گیا۔ عنبر نے اس کی بات سنے بغیر دائیں طرف کو چلنا شروع کر دیا تھا اور وہ خاصے تیز تیز قدم اُٹھا رہا تھا۔ عاقِب اور نسیم نے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ کوئی پچاس ساٹھ گز دور جا کر عنبر ٹھہر گیا۔ اسی لمحے چیخ کی آواز پھر وادی میں گونجی۔ عنبر کان کے

پاس ہاتھ رکھ کر آواز کو غور سے سُننے لگا۔ آواز ختم ہونے کے بعد عنبر پھر واپس ہو لیا۔ جب وہ پہلی جگہ پہنچ کر بھی نہ رُکا اور آگے جانے لگا تو نسیم سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا:

”عنبر! اب شام ہو گئی ہے۔ ہم کب تک اِدھر اُدھر پھرتے رہیں گے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں ڈیری فارم چلنا چاہیے۔ رات کے وقت یہ چیخم دھاڑ کی آوازیں اچھی نہیں لگیں گی۔“

عنبر نے نسیم کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مخالف سمت میں پچاس ساٹھ گز دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر سیاہ وادی میں چیخ گونجی:

”آآآآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔۔۔اووووووووووو۔۔۔اووووووہہہہہ!“

عنبر نے غور سے اُس آواز کو سُنا اور پھر نسیم اور عاقِب کی طرف مُڑ کر بولا۔

”بس۔ فی الحال ہم مزید اِدھر اُدھر نہ پھریں گے۔ میرا تجربہ پورا ہو چکا ہے۔

"تجربہ؟ کیسا تجربہ؟" عاقِب نے کہا۔ "ہم تو اِدھر اُدھر چلتے پھرتے رہے ہیں اور بس!"

"میں نے چیخ تین مختلف جگہوں سے سُنی ہے، اور تینوں جگہوں سے اس جگہ تک ایک ایک فرضی لکیر کھینچی ہے جہاں سے یہ آواز آتی محسوس ہو رہی ہے۔"

عاقِب کی سمجھ میں بات آ گئی۔ "تم مثلّث والے قاعدے پر عمل کر رہے تھے، جس پر انجنیئر عمل کرتے ہیں۔"

"بالکل۔" عنبر نے کہا۔ "میں نے اسی طرح عمل کیا ہے۔ بس ہماری لکیریں یا لائنیں فرضی تھیں مگر میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ لکیریں کہاں ملتی ہیں۔"

"کہاں ملتی ہیں؟" نسیم نے پوچھا۔

"شیرے ڈاکو کے غار پر اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دردناک چیخیں یا

چیخوں کی سی آوازیں شیرے ڈاکو کے غار ہیں سے آ رہی ہیں۔" عنبر نے کہا۔

نسیم کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ وہ بولا۔ "یہ تو ہم لوگوں کو پہلے بھی معلوم تھا۔ چچا اسلم نے ہمیں کل ہی بتا دیا تھا۔"

"یاد رکھو، نسیم! ایک سُراغ رساں ہمیشہ پھُونک پھُونک کر قدم آگے بڑھاتا ہے۔ عنبر نے کہا۔ "چچا اسلم کی معلومات صرف سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اور میں سُنی سنائی باتوں کے بجائے اپنی عقل پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔" وہ مُسکرایا اور پھر بولا۔ "یوں تو ہم لوگ کبھی بھی ضیغم کے بھُوت محل کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے تھے۔"

"لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟" نسیم نے پوچھا۔

"اب ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ آواز غار میں کون پیدا کر رہا ہے اور۔۔۔۔۔۔"

عنبر کی آواز اس پُراسرار چیخ کی آواز میں دب گئی۔

”آآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔۔۔اووووو۔۔۔۔۔۔۔۔۔اوورہہہہہ!“

اب سیاہ وادی میں تاریکی چھانے لگی تھی، کیوں کہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ عاقِب نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ”عنبر، چچا اسلم اور یہاں کا تھانے دار دونوں غار کو دو تین بار دیکھ چکے ہیں۔ انہیں غار میں چیخنے کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔“

”ہو سکتا ہے کوئی جانور ہو، جو غار میں کسی جگہ چھپا ہوا۔“

”اُونہوں!“ عنبر نے کہا۔ ”میں نے آج تک ایسے کسی جانور کی آواز نہیں سنی اور جیسا کہ چچا اسلم نے بتایا وہ اور تھانے دار غار میں گئے تو اُنہیں کچھ بھی نہ ملا۔ اگر اُنہیں کوئی جانور ملتا یا کسی کے پاؤں کے نشانات ملتے تو وہ لوگ اپنی تفتیش کو اور آگے بڑھاتے؟“

”ہاں۔ یوں بھی چچا اسلم اچھے خاصے شکاری ہیں۔ اگر کسی بھی جانور کا نشان

ملتا تو وہ یقیناً اُسے ڈھونڈ نکالتے۔" عاقِب نے کہا۔

"اگر کسی عام جانور کا نشان ملتا تو۔" عنبر نے کہا۔

"کیا مطلب؟" نسیم بولا۔

"مطلب یہ ہے اگر یہ چیخ کی آواز کسی جانور ہی کی ہوئی تو وہ غیر معمولی قسم کا جانور ہو گا۔" اچانک عنبر کی آنکھوں میں شرارت کی سی چمک پیدا ہوئی۔ "ہو سکتا ہے یہ چیخ خود شیر اڈا کو مار رہا ہو۔"

"نہیں نہیں۔" نسیم چلّایا۔ "ایسی باتیں نہ کرو۔ بھُوتوں کا کوئی وجود نہیں۔ ہم خود یہ بات ثابت کر چکے ہیں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ شیرے ڈاکو کا بھُوت ہے۔" عنبر نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو یہ کہا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ خود غار میں چھُپا ہوا چیخیں مار رہا ہو۔"

سیاہ وادی میں اب رات کی تاریکی پھیل چکی تھی، لیکن اُسی لمحے وادی میں

دوسری طرف آسمان سُرخ ہو گیا اور اگلے ہی لمحے وادی میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی۔

تینوں سُراغ رساں خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر نسیم نے کہا۔ "یہ کوئی ڈرنے کی بات نہیں۔"

عنبر نے حیرت سے نسیم کی طرف دیکھا۔ یا تو نسیم ہر ایسی بات پر ڈر جایا کرتا تھا یا اب وہ اُنہیں سمجھا رہا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

چچا اسلم نے بتایا تھا کہ ساحل سے ذرا فاصلے پر یہاں چند غیر آباد جزیرے ہیں جن پر فوجی کبھی کبھار مشقیں کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی جنگی مشق ہو گی۔" نسیم نے کہا۔

"اوہ!" عاقِب جو اب تک خاصا پریشان نظر آ رہا تھا مُسکرانے لگا۔ "میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"آؤ، اب واپس ڈیری فارم پر چلتے ہیں۔" عنبر نے کہا۔ "میں سیاہ وادی اور

شیرے ڈاکو نے غار کے بارے میں کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

تینوں سُراغ رسانوں نے کچّی سڑک پر سے اپنی سائیکلیں اُٹھائیں اور ان پر سوار ہونے ہی لگے تھے کہ وادی میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی، جیسے پتھّر ِگر رہے ہوں اور پھر ایک چیخ اُبھری۔ "ہاآآآآآئےےےے!"

تینوں سُراغ رسانوں کے قدم ایک لمحے کو جم سے گئے!

بڑے میاں

سب سے پہلے عنبر بولا۔ ”یہ چیخ غار کی طرف سے نہیں آئی۔“

”ہاں“ عاقِب نے کہا۔ ”اور نہ یہ پہلے جیسی ہے۔“

”یہ تو کسی انسان کی لگتی ہے!“ نسیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں اُس انسان کو۔۔۔۔۔“

عنبر پہلے ہی آواز کی سمت چل پڑا تھا۔ عاقِب اور نسیم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔

”یوں لگتا ہے جیسے کوئی انسان مُصیبت میں مبتلا ہو۔“ عنبر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ جلد ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں گرد اُڑ رہی تھی۔ وہاں تازہ تازہ پتھّر گِرے تھے۔

”مدد۔۔۔۔۔ مدد کرو!“ ایک کمزور سی آواز آئی۔

اب گرد صاف ہو چلی تھی۔ عاقِب اور نسیم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایک آدمی نیچے گِرا پڑا تھا اور اس کی ایک ٹانگ پر ایک بڑا سا پتھّر پڑا ہوا تھا۔ عنبر نے عاقِب اور نسیم کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور تینوں نے مل کر پتھّر ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن پتھّر بہت بھاری تھا اور لڑکوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ مِل کر اُس پتھّر کو ہٹا سکتے۔

اس آدمی نے اپنا نِچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ اور چیخ روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ پتھّر لڑکوں سے نہیں اُٹھ رہا تو اس نے دانتوں تلے سے ہونٹ نکالا اور کراہتے ہوئے بولا۔ ”ڈیری فارم جا کر اسلم صاحب کو بتا دو۔ وہ آدمی بھیج دیں گے۔“

لڑکوں نے افسوس اور دکھ کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چچا اسلم کا ایک اور آدمی زخمی ہو گیا تھا۔ سیاہ وادی میں ایک اور حادثہ ہو گیا تھا۔

نسیم دو ہفتے کے لیے اسلم صاحب کے ڈیری فارم پر آیا ہوا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اسلم صاحب جو نسیم کے باپ جلال کے ساتھ کام کرتے تھے، اب سیاہ وادی میں زمین خرید کر ڈیری فارم بنا رہے تھے۔ نسیم پچھلے دِنوں کچھ بیمار رہا تھا اس لیے صحت یاب ہونے کے بعد اس کے باپ نے اسے اسلم کے پاس سیاہ وادی بھیج دیا تا کہ وہ کچھ دِن کھُلی ہوا میں گزارے۔ اسلم صاحب نے ڈیری فارم بنوانے کا کام شروع کیا ہی تھا کہ یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

سیاہ وادی میں شیرے ڈاکو کے غار کی طرف سے کسی کے چلّانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ آس پاس کے دیہات کے لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ آوازیں اب سے کوئی پچاس سال پہلے بھی سُنی گئی تھیں لیکن گزشتہ

پچاس سال سے وادی بالکل خاموش تھی۔ ان پچاس سالوں میں یہاں کوئی پُراسرار آواز سنائی نہیں دی، نہ کوئی واقعہ رونما ہوا۔ مگر اسلم صاحب نے یہاں جگہ خرید کر ڈیری فارم بنانا شروع کیا ہی تھا کہ وادی نہ صرف کراہنے لگی بلکہ کئی حادثات بھی ہوئے۔ اسلم صاحب نے ڈیری فارم بنانے کے لیے جو لوگ کام پر لگائے، وہ آس پاس کے علاقوں ہی سے تعلّق رکھتے تھے اور ان واقعات سے پریشان ہو کر ایک ایک کر کے کام چھوڑتے جا رہے تھے۔ یہ واقعات کچھ یوں تھے:

ایک شام دو مزدور گھوڑے پر سوار جا رہے تھے کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ اس آواز کے ڈر سے گھوڑا ایسا بِدکا کہ اس نے مزدُوروں کو زمین پر پھینک دیا۔ ان میں ایک مزدور کا بازو ٹوٹ گیا اور دوسرے کے پیٹ پر خراشیں آئیں۔ جب یہ دونوں واپس ڈیری فارم پر آئے تو اُنہوں نے بتایا کہ وادی میں کوئی پُراسرار سی شے گھوم رہی ہے، جس کی آواز سُن کر گھوڑا بِدک گیا۔ اس واقعے کے بعد وہاں کام کرنے والے مزدور چوکنّے

ہو گئے۔ دو ایک دِن بعد آدھی رات کو ایک باڑے میں سے مویشی نکل کر اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے اور بڑی مُشکل سے اسلم صاحب اور ان کے ملازموں نے صُبح تک اُن کو اکٹھا کیا۔ جانوروں کے بھاگنے کی کوئی وجہ اُن کی سمجھ میں نہیں آئی۔

ابھی اس واقعے کا اثر باقی تھا کہ ایک مزدور نے قسم کھا کر لوگوں کو بتایا کہ شام کو جب وہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو اس نے شیرے ڈاکو کے غار میں سے ایک بھُوت کو نکلتے ہوئے دیکھا! اس بھُوت والے قصّے سے مزدُوروں میں اور بے چینی پیدا ہو گئی۔

اس کے چند دِنوں بعد دو آدمی اچانک غائب ہو گئے اور کسی کو کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گئے۔ کئی دِن بعد تھانے دار کو ایک سپاہی نے بتایا کہ اس نے غائب شُدہ دونوں آدمیوں کو ایک قریبی قصبے کے میلے میں دیکھا تھا۔ تھانے دار کو سپاہی کی بات پر یقین آ گیا تھا، لیکن ڈیری فارم پر کام کرنے والے مزدوروں کو بالکل یقین نہ آیا تھا۔ اور وہ خاصے ڈرے ڈرے، سہمے

سہمے تھے۔

اور اب رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے یہ حادثہ ہو گیا تھا۔

نسیم کو سیاہ وادی میں آئے چند ہی دِن گزرے تھے کہ اس نے محسوس کیا کہ اسلم صاحب مزدوروں کی بے چینی سے کافی پریشان ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسلم صاحب اور تھانے دار شیرے ڈاکو کے غار میں بھی پُراسرار چیخوں کا سُراغ لگانے گئے، مگر اُنہیں کوئی کام یابی نہ ہوئی۔ مزدُوروں میں تو عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں، مگر تھانے دار یا اسلم صاحب یہ نہیں مان سکتے تھے کہ ان چیخوں کا کسی بھُوت پریت سے کوئی تعلّق تھا، اس لیے وہ اُن کی کسی بات پر یقین نہ کرتے تھے۔

نسیم نے اسلم صاحب سے اپنے سُراغ رساں دوستوں عنبر اور عاقِب کا ذکر کیا اور کہا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اُنہیں یہاں بُلا لینا چاہیے۔ چناں چہ اسلم صاحب ایک دِن خود گئے اور عنبر اور عاقِب کو اپنے ساتھ لے آئے۔ یہ واقعہ کل کا تھا۔

گویا ننھے سُراغ رسانوں کو وادی میں آئے چوبیس گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ مگر اس دوران میں یہ نیا واقعہ پیش آ گیا۔

"میں کہتا ہوں کہ یہ سب اس سیاہ وادی کا کیا دھرا ہے۔"

"ہائے!" وہ آدمی درد سے کراہا۔ "مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ اس خوف ناک آواز نے کیا ہے۔ یہ منحوس آواز ہے! ہائے! میں مرا!"

"میرا خیال ہے کہ یہ ایک حادثہ ہے۔" عنبر نے کہا۔ "دراصل اُدھر جزیروں میں فوجی مشقیں ہو رہی ہیں۔ گولا باری سے پہاڑی پر سے کوئی پتھّر لُڑھک گیا۔ یہ پہاڑ خُشک ہیں۔ اس لیے دھماکے سے پتھّر ٹوٹ کر گِر سکتے ہیں۔"

"اونہوں!" اس آدمی نے کہا۔ "یہ سب اس چیخ کا کیا دھرا ہے۔ ہائے ئے ئے ئے ئے ئے!"

”اچھا، گھبراؤ نہیں۔ ہم اسلم صاحب کو ابھی لے کر آتے ہیں۔“عنبر نے کہا۔

ابھی وہ مُڑا ہی تھا کہ اُس نے کچھ فاصلے پر چند گھُڑسوار آتے دیکھے۔ وہ اِدھر ہی آرہے تھے، اس لیے عنبر رُک گیا۔ چند ہی لمحوں میں آنے والے وہاں پہنچ گئے۔ یہ اسلم صاحب تھے اور ان کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔ اسلم صاحب نے ایک خالی گھوڑے کی لگام پکڑ رکھی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اسلم صاحب نے آتے ہی پوچھا۔ ”خیریت تو ہے ؟“

”ہائے ئے ئے!“ وہ آدمی چلّایا۔ ”میری ٹانگ!“

”اوہو!“ اسلم صاحب نیچے اُترے۔ ساتھ ہی اُن کے دونوں ساتھی بھی نیچے اُترے اور سب مل کر زور لگانے لگے۔ ایک دو منٹ کی زور آزمائی کے بعد پتھّر ہٹ گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اسلم صاحب نے اس آدمی سے پوچھا۔

”قادِر۔“ اس نے جواب دیا اور درد سے کراہا۔ ”ہائے ئے ئے ئے!
میں۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔میں کہتاہوں۔“ قادِر نے کہا۔ ”یہ سب کچھ اس
منحوس چیخ کی وجہ سے ہوا۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ کاش میں یہاں کام
کرنے نہ آتا!“

”میرا خیال ہے چچا اسلم، گولا باری کے دھماکے سے پہاڑ پر سے ایک پتّھر
گِر پڑا اور قادِر کے اوپر آ گرا۔“

”بالکل!“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ جب
ہم نے قادِر کا گھوڑا پھِرتے دیکھا تو اِس کی تلاش میں اِدھر آ گئے۔ اس کے
کراہنے کی آواز سے ہم سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔“

اسلم صاحب نے اپنے ایک ساتھی کو ڈیری فارم بھیجا اور اس سے جیپ
منگوائی تاکہ وہ زخمی قادِر کو قصبے کے ہسپتال میں لے جاسکیں۔

جب عنبر، نسیم اور عاقِب سائیکلوں پر ڈیری فارم میں بنی ہوئی اسلم صاحب
کی رہائش گاہ تک پہنچے تو تاریکی چھا چُکی تھی۔ اس ڈیری فارم میں کئی

عمارتیں تھیں۔ جانوروں کے احاطے بھی تھے۔ لیکن سب سے اچھی اور خوب صورت جگہ اسلم صاحب کی رہائش گاہ تھی۔ ان کا ذوق بہت اچھا تھا اور اُنہوں نے اپنے گھر کے آس پاس بڑے خوب صورت گُل بُوٹے اُگا رکھے تھے۔ البتّہ یہ گھر اندر سے ابھی تک مکمّل نہیں ہوا تھا۔ مکان کے ساتھ ہی ایک بڑے سے کمرے میں باورچی خانہ تھا جہاں ڈیری فارم میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے کھانا تیّار ہوتا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگ باورچی خانے کے پاس جمع تھے اور آپس میں گھُسر پھُسر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ سب قادِر کی ٹانگ ٹوٹنے کی خبر یہاں پہنچی ہو گی تو سب لوگوں نے اس بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو گا، اور چوں کہ یہاں کام کرنے والے لوگ وادی کی اس پُراسرار چیخ سے گھبرا جایا کرتے تھے، اس لیے اس حادثے کا ذمّہ دار بھی وہ وادی کی اسی منحوس چیخ کو قرار دے رہے تھے۔

عنبر، نسیم اور عاقِب باورچی خانے کے سامنے سے گزر کر گھر کی جانب جا

رہے تھے کہ ایک کرخت سی آواز آئی۔ ”تم لوگ اب تک کہاں پھر رہے تھے، ہیں؟“

”ہم۔۔۔۔وادی کی سیر کرنے گئے تھے۔“ عنبر نے کہا۔

”یہ وادی کوئی اچھی جگہ نہیں۔ سمجھے؟“ کرخت آواز والے آدمی نے کہا۔ ”یہاں تم لوگ گُم بھی ہو سکتے ہو۔“

”نہیں، جناب۔“ عنبر نے کہا۔ ”ہم پہلے بھی اس طرح کے کھُلے علاقوں میں پھر چکے ہیں۔“

کرخت آواز والا آدمی ایک دو قدم چل کر اُن کی طرف بڑھا اور کہنے لگا ”میری بات مانو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تم کہاں گئے تھے۔ تم چیچ کا کھوج لگانا چاہتے ہو لیکن حفیظ کہتا ہے کہ شیرے ڈاکو کا غار تم جیسے لڑکوں کے جانے کی جگہ نہیں۔ اُدھر بھول کر بھی نہ جانا۔“ اس آدمی نے بڑے پُراسرار انداز میں کہا۔

ننھے سُراغ رساں کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ گھر کا دروازہ کھُلا اور اسلم صاحب کی بیگم نے آواز دی۔ ”یہ تم ان بے چارے بچّوں اور کیوں ڈرا رہے ہو، حفیظ؟ یہ بچّے تمہاری طرح بے وقوف اور ڈرپوک نہیں ہیں۔ اُنہیں خدا نے تم سے کہیں زیادہ عقل اور ہمّت دی ہے۔“

”وہ وادی اچھی جگہ نہیں ہے۔“ حفیظ نے جواب دیا۔

”حفیظ! اتنے بڑے ہو گئے۔“ بیگم نے کہا۔ ”پھر بھی ایک غار سے ڈرتے ہو!“

”میں ڈرتا نہیں ہوں۔ حفیظ نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میں سچّی بات کو سچ مانتا ہوں۔ میں نے اسی وادی میں آنکھ کھولی تھی۔ جب میں بچّہ تھا، تب بھی یہ وادی اسی طرح چیخا کرتی تھی۔ ان بچّوں کے تو باپ بھی اس وقت پیدا نہیں ہوئے ہوں گے۔ میرے باپ کہا کرتے تھے کہ۔۔۔۔۔“

”میں یہ نہیں پوچھتی کہ تمہارے باپ کیا کہا کرتے تھے۔“ بیگم نے کہا۔ ”میں تو اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ بھی یہاں وادی اور اس چیخ کے بارے میں

کہا جاتا ہے، وہ سب وہم ہے، سب غَلَط ہے۔"

"حفیظ صاحب!" عنبر نے کہا۔ "آپ نے اس وادی کو اپنے بچپن میں بھی کراہتے سُنا تھا؟"

"ہاں۔" حفیظ نے بڑے فخر سے کہا۔

"آپ کے خیال میں وادی میں چیخنے کی آواز کِس طرح پیدا ہوتی ہے؟"

"میں کیا اور میرا خیال کیا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ یہ آواز کون پیدا کرتا ہے۔ کئی لوگ شیرے ڈاکو کے غار میں گئے تھے مگر کسی کو بھی چیخنے والی شے نظر نہ آئی۔ میرے باپ کہا کرتے تھے کہ یہ آواز بڑے میاں کی ہے اور بڑے میاں کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کیسے ہیں!"

شیرے ڈاکو کا قصّہ

"حفیظ۔" بیگم چلّائیں۔ "یہ کیا انٹ شنٹ بکے جا رہے ہو؟"

مگر حفیظ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ "میں انٹ شنٹ نہیں بک رہا، بیگم صاحبہ۔ شیرے ڈاکو کے غار نے پچاس سال بعد پھر سے کراہنا شروع کر دیا ہے اور اب تک کوئی بھی اس آواز کا سراغ نہیں لگا سکا۔ اب اگر یہ بڑے میاں کی وجہ سے نہیں ہے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ کس وجہ سے ہے؟"

یہ کہتے ہوئے حفیظ باورچی خانے سے نکل کر مویشیوں کے احاطے کی

طرف چلا گیا۔

بیگم کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ آخر یہ چیخنے اور کراہنے کی سی آواز کون پیدا کرتا ہے۔ وہ بتاتیں تو کیا بتاتیں؟ اُنہوں نے صرف اِتنا کہا۔ ”یہ حفیظ کو کیا ہو گیا ہے! یہ تو بڑا بہادُر آدمی تھا۔ اس نے پہلے تو کبھی بڑے میاں اور چھوٹے میاں کی بات نہیں کی تھی۔ اب اس پر بھی سیاہ وادی کی اس منحوس چیخ کا اثر ہو گیا ہے۔“

”آخر یہ بڑے میاں ہیں کون؟“ عنبر نے بیگم صاحبہ سے پوچھا۔ ”کیوں چچی جان، آپ اس بارے میں کچھ جانتی ہیں؟“

”ارے بیٹا، میں کیا جانوں گی۔ میں تو تُم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو دروازے پر آ گئی۔ اندر آ جاؤ۔ کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ گرم کر کے لاتی ہوں۔“

”آہا! کھانا!“ نسیم نے اِس انداز سے ہونٹوں پر زبان پھیری جیسے اُسے برسوں سے کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ ”مجھے تو سخت بھُوک لگ رہی ہے۔“ یہ

کہتے ہوئے وہ بیگم صاحبہ کے پیچھے ہو لیا۔ عاقِب اور عنبر بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

وہ اندر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ عنبر نے اچانک کہا۔ ”چچا اسلم اس بارے میں ضرور کچھ جانتے ہوں گے۔“

”ہاں۔ ہو سکتا ہے اُنہیں کچھ پتا ہو۔ مگر وہ تو ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔“

”وہ قادِر کو ہسپتال چھوڑ کر آئیں گے۔“ عاقِب نے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔ انور جیپ لینے آیا تھا تو اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔“ اُسی لمحے باہر جیپ رُکنے کی آواز آئی۔ ”اے لو! وہ آ گئے۔“ بیگم نے کہا۔ ”اب جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لینا۔“

اسلم صاحب کے ساتھ ایک دُبلا پتلا آدمی بھی تھا جس نے موٹے موٹے

شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ یہ شخص لڑکوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ کل رات کھانے پر وہ اس ملاقات کر چُکے تھے۔ وہ کچھ عرصے کے لیے اسلم صاحب ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا نام پروفیسر دُرّانی تھا اور وہ کسی تحقیق کے سلسلے میں سیاہ وادی میں آیا تھا۔

”لو، ان سے پُوچھ لو کیا پوچھنا ہے تمہیں۔“ بیگم نے کہا۔

”کیا تفتیش ہو رہی ہے؟“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”بھئی، ہم تو تھک گئے ہیں۔ پہلے کھانا دو، پھر کچھ بات چیت ہو گی۔“

”چچا، وہ۔۔۔۔۔ وہ قادِر۔۔۔۔۔“ عنبر نے پوچھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ اس کے پاؤں کی ہڈّی ٹھیک ٹھاک ہے۔ معمولی چوٹ لگی ہے۔ ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ دو چار دِن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

بیگم نے میز پر کھانا لگا دیا اور پروفیسر اور اسلم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

”میں یہ پوچھ رہا تھا، چچا جان۔“ عنبر نے کہا۔ ”کہ یہ بڑے میاں کیا چیز ہے

یا تھی؟"

اسلم صاحب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ "خوب! تو تم نے بھی بڑے میاں کا ذکر سُن ہی لیا۔ بھئی، یہاں کے لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ غار میں ایک پُراسرار مخلوق رہتی ہے، جو کالی، چمک دار اور بہت بڑی ہے۔ وہ غار کے اندر کسی جگہ پر پانی کے ایک تالاب میں رہتی ہے۔"

"کیا اسے لوگوں نے، میرا مطلب ہے، بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے؟" عنبر نے پوچھا۔

"نہیں۔ کوئی بھی آدمی یہ نہیں کہتا کہ اس نے اس پُراسرار مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"پُراسرار مخلوق کو ہر آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ پُراسرار کہاں رہے گی؟" پروفیسر دُرّانی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

اسلم صاحب نے یہ سُن کر قہقہہ لگایا اور بولے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو

پروفیسر۔ یہاں جس کسی سے پوچھو کہ کیا اُس نے بڑے میاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تو وہ یہی کہے گا کہ نہیں جناب۔ میرے باپ نے، کسی دوست نے، یا میرے بھائی نے دیکھا تھا۔"

"گویا بڑے میاں کا وجود فرضی بھی ہو سکتا ہے۔" عنبر نے کہا۔ "اور اصلی بھی۔"

"پاگل نہ بنو عنبر۔" نسیم نے سُراغ رساں نمبر ایک کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ "تم تو ایسی باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں کہ بڑے میاں واقعی کہیں موجود ہوں گے۔" عنبر نے کہا۔ "مطلب یہ ہے کہ اس قصّے کی تہہ میں کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی کسی وقت کسی آدمی نے مذاق میں کوئی بہروپ بھرا ہو۔ یوں ہی کسی کو ڈرانے کے لیے یا کسی اور مقصد سے اور جب اسے کسی نے دیکھ لیا تو پھر یہ قصّہ مشہور ہو گیا کہ غار میں ایک پُراسرار۔۔۔۔۔"

"بھئی اسلم، تمہارے یہ بھتیجے تو بڑے عقل مند ہیں۔ یہ تو ایسی باتیں

کرتے ہیں جیسے سُراغ رساں ہوں۔" پروفیسر دُرّانی نے کہا۔

عنبر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسلم صاحب بول اُٹھے۔ "بھئی تم نے واقعی اصلی پروفیسروں والی بات کی ہے۔ لاؤ ہاتھ۔ یہ بچّے سچ مُچ سُراغ رساں ہیں اور اب تک کئی گتھیاں سُلجھا چکے ہیں۔ میں نے ان کو یہاں اسی لیے بُلایا ہے کہ غار کی چیخ کا پتا لگائیں۔"

"خوب! بہت خوب!" پروفیسر نے رومال سے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مزہ آگیا! بھئی میں نے کبھی سُراغ رساں نہیں دیکھے، لیکن تم لوگوں کے سوالوں کے انداز اور سوچنے کے طریقے نے مُجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر سُراغ رساں واقعی ہوتے ہیں تو وہ تم لوگوں جیسے ہوتے ہوں گے۔"

عنبر نے مُسکرا کہ اُنہیں سلام کیا اور جیب سے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔

تین ننھے سُراغ رساں

ہم مُشکل سے مُشکل گتھیاں سلجھا سکتے ہیں

؟ ؟ ؟

سُراغ رساں نمبر ایک: عنبر

سُراغ رساں نمبر دو: نسیم

سُراغ رساں نمبر تین: عاقِب

"بھئی، تم تو باقاعدہ سُراغ رساں ہو۔" پروفیسر دُرّانی نے کارڈ پڑھتے ہوئے کہا۔ اسلم صاحب نے بھی کارڈ پڑھا اور پھر مُسکرائے لگے۔

"جناب، یہ بڑے پائے کے سُراغ رساں ہیں۔" اسلم صاحب نے کہا۔ "ایک بار نسیم کے ابّو، جلال صاحب، نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح ان لوگوں نے بھُوتوں کے ایک قصّے کو غَلَط ثابت کیا تھا۔ غالباً ڈھانچوں کے جزیرے پر۔ کیوں بھئی؟"

عاقِب جھٹ سے بول اُٹھا۔ ”جی جناب۔ وہاں یہ قصّہ مشہور تھا کہ ایک لڑکی کا بھُوت گول چکّر پر گھومتا ہے۔“

عنبر اپنا نچلا ہونٹ دائیں ہاتھ سے مسل رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ یکایک اس نے کہا۔ ”چچا جان، اس سیاہ وادی کے غار کو شیرے ڈاکو کا غار کیوں کہتے ہیں، اور یہ شیر اڈاکو کون تھا؟“

”یہ باتیں تمھیں پروفیسر دُرّانی بتائیں گے۔“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”یہ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔“

”تاریخ کا پروفیسر بھلا شیرے ڈاکو کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”لیکن تم لوگوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں اس وادی میں شیرے ڈاکو کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے ہی آیا ہوں۔ میں شیرے ڈاکو پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس کا نام ہے، شیر اڈاکو: داستان اور حقیقت۔ میں تحقیق کر رہا ہوں تو بہت سی سُنی سُنائی باتیں غلط ثابت ہو رہی ہیں، مثلاً یہ کہ یہاں کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ شیر اڈاکو اپنے

دائیں ہاتھ میں پستول رکھتا تھا اور بائیں ہاتھ سے گھوڑے کی باگیں تھامے رکھتا تھا لیکن جب میں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ وہ پستول بائیں ہاتھ میں رکھتا تھا اور گھوڑے کی باگیں اس کے دائیں ہاتھ میں ہوتی تھیں۔ ہے نا عجب سی بات؟"

"جی ہاں۔" عنبر بولا۔ "لیکن پروفیسر صاحب، آپ کو زحمت نہ ہو تو شیرے ڈاکو کا قصّہ ذرا تفصیل سے بتائیے۔"

"بہتر، سنو۔" پروفیسر نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور شیرے ڈاکو کا قصّہ سُنانا شروع کر دیا۔

"آج سے پچاس سال پہلے شیرے کی عمر بیس سال تھی اور وہ ایک لمبا تڑنگا جوان تھا۔ وہ سیاہ داری کے ایک گاؤں مہرپُور میں رہتا تھا۔ اُس کے ماں باپ تھے، بہن بھائی تھے اور اس کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، اس لیے ماں باپ کو سب سے پہلے اُس کی شادی کرنے کا خیال آیا۔ ایک خوب صورت سی لڑکی سے، جو

شیرے کی ماں کے رشتے داروں میں سے تھی، اُس کی شادی کر دی گئی۔ کچھ عرصے بعد شیرے کے ہاں ایک چاند سالڑکا پیدا ہوا اور اُسی لڑکے کے باعث وہ شیرے سے شیر اڈاکو بنا۔

ہوا یوں کہ ایک دِن اُس کا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ شیر اڈاکٹر کو لانے کے لیے آدھی رات کو گھوڑے پر سوار ہو کر قصبے میں پہنچا۔ ڈاکٹر نے شیرے کے ساتھ گاؤں جانے سے انکار کر دیا، جس پر شیرے کو غصّہ آ گیا۔ اس نے ڈاکٹر کے ساتھ گستاخی کی، جس پر ڈاکٹر نے پولیس کو ٹیلے فون کر کے اُسے حالات بھجوا دیا۔ جب شیر ا چھُوٹ کر مہرپُور پہنچا تو اُس کا بچّہ مر چکا تھا۔ اس کا خون کھول اُٹھا۔ وہ پاگل سا ہو گیا اور اس نے ڈاکٹر کو جان سے مار دیا اور پھر فرار ہو گیا۔ پولیس نے اُس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے پوچھا، لیکن کسی نے اُس کا پتا نہ بتایا۔ پتا نہیں انہیں اس کا پتا معلوم بھی تھا یا نہیں آخر ایک دِن شیر ا پکڑا گیا، اُس پر مقدمہ چلا اور اُسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ لیکن پھانسی کی تاریخ سے دو دِن پہلے وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ پولیس نے

اُس کا پیچھا کیا تو وہ اس غار میں جا گھُسا۔ پولیس نے اس پر کئی فائر کیے۔ ایک گولی اُس کے لگی بھی، لیکن وہ زخمی ہونے کے باوجود، غار میں چلا گیا۔

"پولیس نے غار کا منہ بند کر دیا اور باہر سپاہیوں کا پہرا بٹھا دیا تا کہ شیرا ڈاکو باہر نکلے تو اُسے گرفتار کر لیا جائے۔

"سپاہی غار کے پاس بیٹھے انتظار کرتے رہے اور ڈیوٹی بدلتے رہے مگر شیرا ڈاکو باہر نہ نکلا۔ ایک دِن گُزرا، دو دِن گُزرے، تین دِن گُزر گئے۔ آخر پولیس کو تشویش ہوئی تو سپاہی اندر گئے اور سارا غار چھان مارا، مگر شیرے ڈاکو کا کہیں پتانہ تھا۔

پولیس افسر بہت حیران ہوا۔ جب سے شیرا غار میں گھُسا تھا، اندر سے کراہنے کی سی آواز آتی رہی تھی، جیسے کوئی درد سے چلّا رہا ہو۔ افسر کا خیال تھا کہ یہ زخمی شیرے کی آواز ہے اور وہ درد اور تکلیف سے بے کل ہو کر کراہ رہا ہے۔ مگر جب تلاش کے باوجود شیرا ڈاکو نہ ملا تو وہ لوگ بہت حیران ہوئے۔

احتیاط کے طور پر دو تین ہفتے تک غار پہ پہرا بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ہٹا لیا گیا۔ شیرا غار کے اندر اتنے دِن بغیر کچھ کھائے پیئے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

اس کے بعد شیرے ڈاکو کو کسی نے نہیں دیکھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ شیرا غار کے اندر مر گیا۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ غار کے کسی خُفیہ راستے سے باہر چلا گیا اور کسی اور جگہ جا کر رُوپوش ہو گیا۔ کُچھ کہتے تھے کہ وہ غار کے اندر ہی رہتا ہے اور اب تک زندہ ہے۔ اس کے بعد کہیں کوئی چوری ہوتی یا آس پاس کے علاقے میں کوئی ڈاکا پڑتا جس کا پولیس سُراغ نہ لگا سکتی، تو لوگ کہتے کہ یہ شیرے ڈاکو کا کارنامہ ہے۔ دوسری طرف غار میں سے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں اور پھر یہ غار شیرے ڈاکو کا غار کہلانے لگا۔

اس کے کچھ عرصے بعد چیخنے اور کراہنے کی یہ دردناک آواز آنا بند ہو گئی۔" پروفیسر دُرّانی نے قصّہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اور لوگوں نے آواز بند ہونے کے بعد یہ کہنا شروع کہ دیا کہ اب شیرا اڈاکو ڈاکے مار مار کے

تھک گیا ہے اور آرام کرنا چاہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شیر اڈا کو جب چاہے گا غار سے باہر آ کر ڈاکے ڈالنے لگے گا۔ اُس کے بارے میں کئی اور طرح کی باتیں بھی مشہور کر دی گئیں۔

"مثلاً؟" عنبر نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ وہ ایک نیک دل ڈاکو تھا۔ امیروں کو لُوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ سلطانہ اور جگّا ڈاکو کی طرح!"

عنبر، نسیم اور عاقِب بڑی دل چسپی سے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ اچانک نسیم بولا۔ "تو پروفیسر صاحب، کوئی بھی یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ شیرا ڈاکو مر گیا ہے۔"

"ہاں، اسی لیے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہے اور سچ پُوچھو تو وہ زندہ ہو بھی سکتا ہے۔"

"اچھا!" نسیم کا منہ حیرت سے کھُلے کا کھلا رہ گیا۔

”ہاں۔“ پروفیسر دُرّانی نے کہا۔ ”آج سے پچاس سال پہلے وہ بیس سال کا تھا، تو آج ستّر سال کا ہو گا!“

سُراغ کی تلاش

”مذاق نہ کرو، پروفیسر۔“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”بھلا ستّر سال کا بوڑھا ڈاکے ڈال سکتا ہے!“

پروفیسر دُرّانی نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں، ہمارے ملک میں ہُنزہ کے علاقے میں ستّر تو کیا اسّی اسّی سال کے بوڑھے گھُڑسواری کرتے ہیں اور جوانوں کی طرح صحت مند ہوتے ہیں۔ سیاہ وادی بھی پہاڑی علاقہ ہے۔ اگرچہ ہُنزہ کی طرح خوب صُورت اور سرسبز

وشاداب نہیں۔ اور پھر بھی ہمارا شیر اڈا کو تو صرف چیخیں ہی مار رہا ہے۔"

"یہ تو خیر ممکن نہیں کہ شیر ا چیخیں مار رہا ہو۔" عنبر نے کہا۔ "میں نے آج شام یہ چیخیں سُنی ہیں۔ میرے خیال میں یہ انسانی چیخیں نہیں ہو سکتیں۔"

"میرے خیال میں یہ آواز غار میں ہوا کے داخل ہونے اور باہر آنے سے پیدا ہوتی ہے۔" اسلم صاحب نے کہا۔

"چچا جان، آپ اور تھانے دار تو غار کی تلاشی لے چکے ہیں۔" عنبر نے کہا۔

"ہاں بیٹے۔ میں اور تھانے دار غار کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک گئے تھے اور ہمیں وہاں چڑیا کا بچّہ تک نہیں ملا۔"

"آپ کو غار کے اندر کوئی نئی تبدیلی نظر آئی تھی؟" عنبر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"تبدیلی؟" اسلم صاحب نے ماتھے پہ بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

”میں نے سُنا ہے کہ چیخ کی یہ آواز ایک ماہ سے دوبارہ آنا شروع ہوئی ہے، ورنہ پچاس سال پہلے یہ آواز بند ہو چکی تھی۔“

”تم نے ٹھیک ہی سُنا ہے۔“

”اب اگر یہ آواز غار کے اندر سے ہوا کے گزرنے کے باعث پیدا ہو رہی ہے تو لازمی بات ہے کہ غار کے اندر ایک ماہ پہلے کوئی نہ کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ کوئی نیا راستہ پیدا ہوا ہے یا کوئی پرانا راستہ بند ہوا ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔“

”مگر ہمیں تو غار کے اندر کوئی اس قسم کی تبدیلی نظر نہیں آئی۔“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”تھانے دار نے بھی کوئی نئی بات نہیں دیکھی۔“

”ایک اور بات، چچا جان۔“ عنبر نے کہا۔ ”جہاں تک میرے سُننے میں آیا ہے، یہ چیخوں کی آواز شام پڑے ہی آتی ہے یا جب شام میں ایک آدھ گھنٹا باقی ہو یا پھر رات کے وقت۔ اب اگر یہ آواز ہوا کے باعث پیدا ہوتی ہے تو کیا دِن کے وقت ہوا نہیں چل رہی ہوتی؟“

”تم بہت ذہین ہو ماسٹر عنبر!“ پروفیسر نے عنبر کی کمر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک ہی کہتے ہو، شاید۔“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”البتّہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آواز ہوا کے ساتھ کسی اور چیز کے باعث بھی پیدا ہوتی ہو۔ اور جب وہ چیز بدل جاتی ہو تو۔۔۔۔ مگر غار کے اندر کوئی چیز کیسے بدل سکتی ہے؟“

”بدل سکتی ہے۔“ پروفیسر دُرّانی نے عینک کے پیچھے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

”کیسے؟“

”شیرا ڈاکو بدل سکتا ہے!“

عنبر نے ہونٹ مسلتے ہوئے کہا۔ ”یہ جاننے کے لیے تو شیرے ڈاکو سے ملاقات کرنا پڑے گی۔“

”میں چُوں کہ شیرے ڈاکو پر تحقیق کر رہا ہوں۔“ پروفیسر نے جیب میں

سے ایک تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے میں نے اُس کی ایک تصویر بھی حاصل کی ہے۔ یہ تصویر مجھے پبلک لائبریری میں ایک پرانے اخبار میں ملی تھی۔ یہ اس کی نقل ہے۔“

عنبر تصویر دیکھنے لگا۔ عاقِب اور نسیم بھی اُس پر جھک گئے۔ اسلم صاحب بھی ذرا آگے کو سِرک آئے۔

شیرا تصویر میں ایک بیس اکیس سالہ نوجوان لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ نقاب تھا اور سر پر کالی پگڑی۔ قمیص اور شلوار بھی کالی تھی۔ گویا سر سے پیر تک وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار تھا۔

”کیا وہ ہمیشہ سیاہ کپڑے ہی پہنا کرتا تھا، پروفیسر صاحب؟“ عنبر نے پوچھا۔

”ہاں، وہ ہمیشہ سیاہ کپڑے ہی پہنتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اپنے بچّے کا سوگ منا رہا ہے۔“ پروفیسر نے جواب دیا۔

"میں کل پھر تھانے دار سے ملوں گا اور اس سے کہوں گا کہ شیرے ڈاکو کو ایک مرتبہ پھر غار میں تلاش کیا جائے تاکہ یہ جھنجھٹ ختم ہو۔" اسلم صاحب نے کہا۔ "اور بچّو! اب تم بھی سونے کی تیّاری کرو۔ کل ڈیری فارم میں تمہیں بھی کافی کام کرنا پڑے گا۔ نسیم! جلال صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں ڈیری فارم کا کام پوری طرح سمجھا دوں۔"

"ابھی تو مجھے نیند نہیں آرہی، چچا جان۔" نسیم نے کہا۔

"اور مجھے بھی نہیں آرہی۔" عاقِب نے بتایا۔

"اور مجھے تو بالکل نہیں آرہی۔" عنبر بولا۔ "یوں بھی ہم یہاں آرام کرنے تو آئے نہیں۔ ہمارا تو مطلب۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ہمیں یہاں سیر سپاٹا بھی کرنا ہے۔ شہر میں اتنی صاف ستھری فضا کہاں ہوتی ہے جیسی یہاں ہے۔"

"اور کیا۔" نسیم اور عاقِب نے ایک دم کہا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ عنبر کیا کہنا چاہتا ہے۔

”اب تو چاند بھی نکل آیا ہے۔ میرا خیال ہے، چچا جان، کہ آپ ہمیں سمندر کے کنارے، تھوڑی سی دیر ٹہلنے کی اجازت دے دیں۔ سچّی بڑا مزا آئے گا وہاں اس وقت۔“ نسیم نے کہا۔

”اس وقت! سمندر کے کنارے!“ بیگم نے کہا اور اسلم صاحب کی طرف دیکھا۔

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ یہ کہہ کر اسلم صاحب نے گھڑی دیکھی اور پھر بولے۔ ”ابھی سوا آٹھ بجے ہیں۔ تم لوگ سیر کرتے چلے جاؤ۔ لیکن میں ساڑھے دس بجے تک واپس آجانا۔“

عنبر، نسیم اور عاقِب فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر آتے ہی عنبر نے کہا۔ ”نسیم، تم جانوروں کے چارے والے کمرے میں جاؤ اور صبح جو رسّی وہاں دیوار پر لٹکی ہوئی دیکھی تھی، وہ اُتار لاؤ۔ اور عاقِب، تم دوسری منزل پر ہمارے سونے کے کمرے میں جاؤ اور وہاں سے رنگین چاک اور ٹارچیں اُٹھا لاؤ۔ میں جا کر سائیکلوں کو دیکھتا ہوں کہ اُن میں ہوا کی ضرورت تو

نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم غار کے اندر جا رہے ہیں۔" نسیم نے پوچھا۔

"بالکل۔" عنبر نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ وادی کے چیخنے کا سبب ہمیں صرف غار کے اندر جا کر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔"

"اس وقت؟ رات کو؟" نسیم نے تھُوک نگلتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ کل دِن میں چلیں؟"

"چیخنے کی آوازیں صرف رات ہی کو آتی ہیں۔ دِن میں گئے تو کیا پتا چلے گا؟ دُوسرے آج رات تو غار میں سے چیخنے کی آواز آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کل رات کو نہ آئے کیوں کہ غار ہر رات نہیں چیختا۔ اور تیسرے یہ کہ غار کے اندر دِن کو بھی اتنا ہی اندھیرا ہوتا ہے جتنا کہ رات کو۔" عنبر نے پوری تفصیل سے نسیم کو سمجھایا۔

نسیم رسّی لینے چلا گیا اور عاقِب بھی چاک اور ٹارچیں لینے چلا گیا۔ عنبر نے

رسّی کو کیریئر میں باندھا، چاک جیب میں ڈالے، ٹارچ ہاتھ میں لی اور سائیکل پر بیٹھ گیا۔ عاقِب اور نسیم بھی اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہو گئے۔

سیاہ وادی کافی بڑی تھی اور اس وقت خاموش تھی۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے جہاں لوگ کھیتی باڑی کر کے پیٹ پالتے تھے۔

تینوں سُراغ رسانوں کی سائیکلیں چلی جارہی تھیں۔ اب وہ ڈیری فارم سے کافی دور آ گئے تھے کہ اچانک وادی میں وہی پُراسرار چیخ اُبھری۔

”آآآآآآآآآآہہہہ۔۔۔۔اووووو۔۔۔۔۔۔اوووووہہہہہ!“

نسیم اور عاقِب گھبرا کے سائیکلوں پر سے اُتر گئے حال آں کہ یہ آواز اُن کے لیے اب اجنبی نہ تھی۔ عنبر کو بھی سائیکل سے اُترنا پڑا۔

”بہت خُوب!“ اُس نے عاقِب اور نسیم کی طرف توجّہ دیے بغیر کہا۔ ”یہ تو بہت اچھا ہوا کہ شیرے ڈاکو کے غار نے چیخنا بند نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ہمیں سُراغ لگانے میں آسانی ہو گی۔ اب ہمیں جلدی سے اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔“

اُنھوں نے جلدی جلدی اپنی سائیکلیں ایک جگہ کھڑی کیں اور چاندنی میں چمکتی ہوئی چٹّان پر سے ہوتے ہوئے غار کے تاریک دہانے کی طرف چل دیے، غار کا تاریک منہ یُوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی دیو اپنے شکار کو نگلنے کے لیے تاک لگائے بیٹھا ہو۔

"عنبر!" عاقِب نے آہستہ سے کہا۔ "مُجھے لگ رہا ہے کہ یہاں ہمارے علاوہ اور بھی کوئی چل پھر رہا ہے!"

"اور مجھے یُوں لگ رہا ہے۔" نسیم نے تھُوک نگلتے ہوئے کہا۔ "جیسے کوئی آس پاس کھڑا ہمیں دیکھ رہا ہے۔"

"تمھیں ایسے موقعوں پر زیادہ ہی نظر آنے لگتا ہے۔" عنبر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تمہارا وہم ہے۔ ایک کو آوازیں سُنائی دے رہی ہیں اور دوسرے کو شکلیں نظر آ رہی ہیں مگر مجھے دونوں میں سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ چُوں کہ پُر اسرار چیخ نے ماحول کو پُر اسرار بنا دیا ہے اس لیے تم لوگ۔۔۔۔۔ چلو، چھوڑو۔ آؤ، اب غار کے اندر چلتے ہیں۔"

تینوں نے اپنی اپنی ٹارچ کو جلا بُجھا کر دیکھا اور پھر عاقِب نے عنبر کے کیریئر سے رسّی اُٹھا کر نسیم کے کندھے پر لٹکا دی۔ ہر ایک نے ایک چاک ہاتھ میں لے لیا۔ اب وہ غار کے اندر جانے کے لیے بالکل تیّار تھے۔

غار کے دہانے میں داخل ہونے سے پہلے عنبر نے کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلیں گے، اور اگر کہیں راستہ تنگ ہو گیا تو رسّے کی مدد سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلّق قائم رکھیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ عاقِب نے کہا۔

”اور اپنے اپنے چاک سے اس سمت میں تِیر کا نشان بناتے جائیں گے۔ جدھر ہم جا رہے ہوں گے تاکہ واپسی پر کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس طرح راستہ بھُولنے سے بچ جائیں گے۔ اور اپنے چاک کے نشانوں کو دیکھ دیکھ کر واپس آ جائیں گے۔“ عنبر نے پوچھا۔

”ٹھیک۔“ عاقِب نے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔“نسیم نے بھی کہا۔

ہر سُراغ رساں کے چاک کا رنگ جُدا جُدا تھا۔ اس لیے وہ نشان دیکھ کر یہ پہچان لیتے تھے کہ کون سا سُراغ رساں کِدھر گیا ہے۔ عنبر کے چاک کا رنگ سفید تھا، نسیم کے چاک کا نیلا اور عاقِب کے چاک کا سبز تھا۔

اُسی لمحے غار پھر چیخا ”آآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔ اووووووو۔۔۔۔ اووووووووہہہہہ!“

”غار ابھی کراہ رہا ہے!“ عنبر نے کہا۔ ”ہمیں فوراً اندر داخل ہو جانا چاہیے۔“ اس سے پہلے کہ سُراغ رساں آگے قدم بڑھاتے، اُنہیں اُوپر، چٹّانوں پر، ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ تینوں نے اُوپر دیکھا۔

چٹان کے اُوپر سے ایک بڑا سا پتھّر لڑھکتا ہوا تیزی سے نیچے آ رہا تھا، جس کے باعث چھوٹے چھوٹے پتھّر بھی ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گِر رہے تھے۔ یہ اُنہی پتھّروں کے گرنے کا شور تھا۔

بڑا پتھّر بڑی تیزی سے نیچے آرہا تھا۔

"ہٹ جاؤ!" نسیم چلّایا اور اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ عاقِب نے بھی چھلانگ ماری اور کئی فٹ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

لیکن عنبر آنکھیں پھاڑے، بے حس وہیں پر کھڑا رہا جہاں بڑا پتھّر گِرنے والا تھا!

یُوں لگتا تھا جیسے اس پر کسی نے جادُو کر دیا ہے!

پُراسرار بوڑھا

نسیم پھٹی پھٹی آنکھوں سے عنبر کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اُٹھا اور عنبر کو دبوچ کر پرے لے گیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ بڑا سا پتھّر عین اُس جگہ دھڑام سے گِرا جہاں پہلے عنبر کھڑا ہوا تھا۔ اگر نسیم بروقت عنبر کو وہاں سے نہ ہٹا دیتا تو اُس کی ہڈّیوں کا سُرمہ بن جاتا۔

"شکر ہے۔" عاقِب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "نسیم، تم نے نہایت شاندار کارنامہ کیا ہے۔"

”مگر تمہیں ہو کیا گیا تھا؟“ نسیم نے عنبر سے پوچھا۔

”پتا نہیں کیا بات تھی۔ بس مُجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے ہوں۔“ عنبر نے کپڑوں پر پڑی ہوئی گرد جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بالکل پُر سکون تھا۔ ”بعض اژدہوں کی آنکھوں میں ایسی قوّت ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکار کو مسحور کر دیتے ہیں اور پھر اُسے ہڑپ کر لیتے ہیں! میرا خیال ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔“

عاقِب نے کہا۔ ”لیکن پتھّر تو بے جان چیز ہے۔ اگر وہ جاندار ہوتا تو ہم یہ سوچ سکتے تھے کہ اس نے تم پر جادُو کر دیا ہے۔“

اتنے میں نسیم چلّایا۔ ”عنبر! اس پتھّر پر تو کچھ نشان پڑے ہوئے ہیں!“ وہ پتھّر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”نشان تو ہوں گے ہی۔“ عاقِب نے کہا۔ ”آخر یہ چٹّان کے اوپر سے لڑھک کر، پتھّروں سے ٹکراتا ہوا آیا ہے۔“

”میرا مطلب ہے، یہ پتھّر کسی آدمی نے چٹان کے اُوپر سے لڑھکایا ہے۔“ نسیم نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“عنبر نے کہا۔

”لیکن آج شام قادِر کے ساتھ بھی تو اِسی قسم کا حادثہ پیش آیا ہے۔“ عاقِب نے کہا۔ ”جب تو تم کہہ رہے تھے کہ پہاڑ خُشک ہیں اور جنگی مشقوں میں ہونے والی گولا باری کی دھک سے ان کے پتھّر ٹوٹ سکتے ہیں۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ پتھّر واقعی کسی نے گرایا ہے۔“عنبر نے کہا۔ ”البتّہ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“

”لیکن ہمیں اوپر کوئی آدمی نظر نہیں آیا!“ عاقِب بولا۔

”بھئی اگر کوئی آدمی سچ مچ اُوپر ہو اور اُس نے یہ پتھّر ہم پر پھینکا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرے گا کہ ہم اسے دیکھ لیں۔“عنبر نے کہا۔

”میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں واپس ڈیری فارم چلنا چاہیے۔“نسیم نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن ہمیں ذرا محتاط رہنا چاہیے۔" عنبر نے کہا۔ "اور جلدی سے غار کے اندر چلے جانا چاہیے۔ اگر واقعی کوئی آدمی اوپر تھا تو وہ ہم پر غار کی چھت نہیں گِرا سکے گا۔" وہ مُسکرایا۔

تینوں سُراغ رساں غار کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں اندھیرا تھا، اس لیے انہیں ٹارچ جلانا پڑی۔ طے یہ پایا کہ ایک وقت میں ایک ٹارچ جلائی جائے گی تاکہ ایک کی بیٹری ختم ہو جائے تو دوسری اور پھر تیسری ٹارچ کام میں لائی جا سکے۔ عاقِب نے سب سے پہلے ایک نشان بنایا اور پھر تینوں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔

غار کی دیواریں پتھریلی تھیں، لیکن یہ پتھّر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہموار ہو گئے تھے۔ چھت پانچ فٹ کے قریب اونچی تھی، اس لیے تینوں سُراغ رساں کھڑے ہو کر، اطمینان سے آگے بڑھ سکتے تھے کیوں کہ کسی کا بھی قد پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ کوئی دس پندرہ گز کے بعد غار چوڑا ہو گیا، اور ایک بڑی سی کھُلی جگہ آ گئی جسے گپھا کہا جاتا ہے۔ عنبر نے ٹارچ کی

روشنی کو گپھا میں اِدھر اُدھر پھِرایا۔ ”یہ ایک بڑے سے ہال کمرے کی مانند ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے آج تک اتنی بڑی گپھا نہیں دیکھی۔“ اس کی آواز گپھا میں گونج رہی تھی۔ ”نہیں دیکھی۔۔۔۔۔۔ دیکھی۔۔۔۔۔۔ کھی۔۔۔۔ ای۔۔۔ ای!“

عنبر نے اچانک کہا۔ ”ادھر دیکھو!“

ٹارچ کی روشنی گُھا کی ایک دیوار پر پڑی جس میں راستہ سا بنا ہوا تھا اور ایک بڑے سے سوراخ کی شکل میں نظر آرہا تھا۔ عنبر نے ٹارچ کو چاروں طرف دیوار پر گھُمایا۔ کئی جگہ پر اُنہیں اسی طرح کے راستے نظر آئے، جس طرح ایک راستے سے وہ یہاں تک آئے تھے۔ جب وہ چاروں طرف روشنی گھُما چکا تو اس نے گنا۔ یہ راستے کُل دس تھے۔ ان میں سے ایک راستے سے تو وہ یہاں تک آئے تھے اور باقی نو راستے آگے، مختلف سمتوں میں، جارہے تھے۔

”اُف!“ نسیم نے کہا۔ ”یہاں تو اتنے سارے راستے ہیں۔ کس راستے پر

جائیں؟" سارے راستے ملتے جلتے تھے۔ کوئی چار فٹ اُونچا تھا تو کوئی پانچ فٹ۔ عنبر بھوئیں سکیڑ کر بولا۔ "اس گپھا میں اتنے سارے راستے ہیں۔ تبھی تو پولیس کو شیر اڈاکو یا کوئی بڑے میاں یہاں نہیں مل سکے۔ ہو سکتا ہے پولیس ہر راستے پر جا ہی نہ سکی ہو۔"

"ہاں۔ ویسے بھی یہاں تو کوئی شخص بھی راستہ بھُول سکتا ہے۔" نسیم نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے جغرافیے میں پڑھا ہو گا کہ چٹانیں مختلف طرح کی ہوتی ہیں۔" عنبر نے بتایا۔ "اب جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں کوئی نرم چٹان ہو گی، جو پانی سے بہہ کر چلی گئی اور اُوپر سخت چٹان کھڑی رہ گئی۔"

"یہ تو بڑی خوف ناک بات ہے۔ ایک چٹان کتنے عرصے میں بہہ جاتی ہو گی؟" نسیم نے کہا۔

"ڈرو نہیں،" عنبر نے کہا۔ "اس عمل میں لاکھوں سال لگتے ہیں۔ یہ کوئی ایک دِن میں نہیں ہو جاتا۔"

”کیا یہ سب راستے اسی طرح بنے ہیں؟“ عاقِب نے پوچھا۔

”نہیں۔ تم نے دیکھا ہے کہ بعض راستے چھوٹے ہیں اور بعض بڑے۔“ عنبر نے کہا۔ ”بعض راستے اس میں کان کنوں نے بنائے ہوں گے جو مختلف چیزوں کی تلاش میں یہاں آئے ہوں گے۔ اُن کے بنائے ہوئے راستے قدرتی راستوں کی نسبت چھوٹے ہوں گے۔“

”کیا ہم یہاں کھڑے باتیں ہی کرتے رہیں گے؟“ نسیم نے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کام ہم کل کر لیں گے۔“

”ابھی ہم نے کیا ہی کیا ہے۔“ عنبر نے کہا۔ ”کام تو اب شروع ہو گا۔ ہم ایک ایک کر کے اِن راستوں پر جائیں گے۔ شاید ہمیں چیخوں کا کوئی سُراغ مل جائے۔“

”ان سارے راستوں پر جانے کے لیے تو مہینوں چاہئیں۔“ عاقِب نے کہا۔ ”میں شرط لگا سکتا ہوں کہ یہ راستے آگے چل کے اور گپھاؤں میں مل جاتے ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ عنبر نے کہا۔ ”لیکن سُراغ رساں ہمّت نہیں ہارتے اور ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ چیخنے یا کراہنے کی سی آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔ بس ہم اُسی راستے پر چل پڑیں گے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ نسیم نے بڑے جوش سے کہا۔ ”ان سارے راستوں پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو صرف آواز والے راستے پر۔۔۔۔۔۔“

”عنبر!“ عاقِب یکایک چلّایا۔ ”تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔ ہمارے غار کے اندر آتے ہی چیخنے کی آواز بند ہو گئی ہے۔ ایک بار بھی آواز نہیں آئی۔“

عاقِب نے صحیح کہا تھا۔ اُن کے اندر آنے کے بعد چیخوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔

”ایسا کیوں ہوا ہے؟“ نسیم نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”ابھی تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ عنبر نے کہا۔ ”یہ محض اتّفاق بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر بعد وہ آواز پھر آنے لگے۔“

تینوں سُراغ رساں دس منٹ تک گپھا کے اندر چُپ چاپ کھڑے رہے، لیکن کوئی چیخ سنائی نہ دی۔

”جب ہم غار کے دروازے کے قریب تھے اور وہ پتھّر لڑھکا تھا، اس وقت تو آواز آ رہی تھی۔“ نسیم نے کہا۔

”ہاں، اس کے بعد نہیں آئی۔“ عنبر نے کہا۔ ”چچا کہتے تھے کہ یہ چیخیں باقاعدہ سنائی نہیں دیتیں۔ کبھی آتی ہیں اور کبھی نہیں۔“ وہ رُکا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے، ہمیں ایک ایک کر کے اِن راستوں پر جانا چاہیے، شاید کسی قسم کا سُراغ مل جائے۔“

وہ ایک سوراخ میں داخل ہوئے لیکن تھوڑی دُور جا کے راستہ بند ہو گیا۔ اسی طرح ایک دو اور راستے بھی بند ملے۔

”میرا خیال ہے، ہم تینوں الگ الگ راستوں پر جائیں۔ اگر ہم میں سے کسی کو کوئی خاص بات نظر آئے تو واپس آکر دوسروں کو بتا دے۔“ عنبر نے کہا۔ ”اس طرح ہم کافی وقت بچا سکتے ہیں۔“

یہ ترکیب پسند کی گئی۔ تینوں سُراغ رساں چاک اور ٹارچ ہاتھ میں لیے ایک ایک راستے پر چل پڑے۔

عنبر کا راستہ تھوڑی دیر تک تو ٹھیک ٹھاک رہا۔ اس کے بعد تنگ ہوتا گیا اور آخر کار آگے جا کے بند ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ راستہ انسان کا بنایا ہوا ہے، یعنی یہاں معدنیات کی تلاش میں کھدائی کی گئی اور پھر ناکام ہو کر چھوڑ دی گئی۔ اس نے ٹارچ سے راستے کے آخری سِرے کو دیکھا۔ وہاں اسے ایک سیاہ پتھر عجیب سا لگا۔ اس نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا اور جیب میں ڈال رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ ”عنبر! عاقِب جلدی آؤ!“

عنبر واپس چل پڑا۔ عاقِب نے بھی اسی لیے نسیم آواز سُنی اور وہ بھی واپس دوڑا۔ جب وہ گپھا میں واپس آیا تو کسی چیز سے ٹکرایا اور چیخ مار کر گر پڑا۔

”اٹھو عاقِب!“ عنبر نے اُس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر کہا۔ ”ڈر گئے؟ یہ تو میں ہوں۔ عنبر!“

”اوہ!“ عاقِب کھسیانا سا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”میرا دل تو اب تک دھڑک رہا ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔“

”ہمیں نسیم نے بلایا تھا۔ مگر وہ ہے کہاں؟“ عنبر نے ٹارچ سے اِدھر اُدھر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

”وہ واپس اپنے راستے پر چلا گیا ہے، شاید۔“ عاقِب نے کہا۔ ”آؤ ہم اس کے پاس جائیں اور دیکھیں کہ اُس نے کیا دیکھا ہے۔“

وہ دونوں نیلے رنگ کے چاک کے نشان والے راستے میں داخل ہو گئے۔ یہ راستہ عاقِب اور عنبر والے راستوں سے زیادہ کھُلا تھا۔ سُراغ رساں نمبر ایک اور سُراغ رساں نمبر تین تیز تیز چلتے ہوئے نسیم کی طرف بڑھے۔ جلد ہی ان کے چہروں پر ٹارچ کی روشنی پڑی جو نسیم کی ٹارچ ہی کی تھی۔ جب وہ نسیم کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نسیم ایک گپھا میں

کھڑا ہوا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، جیسے اس نے کسی بھُوت کو دیکھ لیا ہو۔ "یہ۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہاں پر۔۔۔ کچھ تھا۔" نسیم نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"کیا؟" عنبر اور عاقِب کے منہ سے نکلا۔

"بس کچھ تھا۔" نسیم گھگھیایا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا۔ بالکل سیاہ، چمک دار!"

عاقِب اور عنبر نے اپنی ٹارچ گپھا میں اِدھر اُدھر گھُمائی۔ وہاں کسی سیاہ اور چمک دار چیز کا وجود نظر نہ آیا۔

"میں کہتا ہوں کہ ابھی ابھی وہ چیز یہاں تھی۔" نسیم نے کہا۔ اب اس کے ہوش و حواس بحال ہو رہے تھے۔ "جب میں اس سُرنگ نُما راستے سے باہر گُھا میں نکلا تو اس کو یہاں کھڑا دیکھا۔ ڈر کر تمہیں پُکارا اور واپس جانے لگا، لیکن خوف زدہ تھا کہ گھبراہٹ میں ٹارچ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نیچے جھُک کر ٹارچ اُٹھائی تو وہ غائب ہو چُکا تھا۔"

عاقِب بولا۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ اس کے دماغ میں حفیظ کا بتایا ہوا 'بڑے میاں' تھا اور اس نے ڈر کر محض اپنے وہم سے۔۔۔“

عنبر نے ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، نسیم نے سچ مچ کوئی شے دیکھی ہے۔ یہ اس کا وہم نہیں۔۔۔۔۔ دیکھو!“

عاقِب اور نیم نے فرش پر دیکھا۔ وہاں پاؤں کے بڑے بڑے نشان پڑے تھے، جیسے کوئی بڑا سا گوریلا یہاں پھر تا رہا ہو۔

”میں تو کہتا ہوں کہ یہاں سے بھاگ چلو۔“ نسیم نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا۔ ”حفیظ نے جِن بڑے میاں کا ذکر کیا تھا، میرا خیال ہے کہ میں نے اُنہیں ہی دیکھا ہے!“

”پاگل نہ بنو!“ عنبر نے کہا۔ ”ہم لوگ کسی بھُوت پریت اور چھوٹے یا بڑے میاں کو نہیں مانتے۔“

اُسی لمحے ان پر ایک چمک دار روشنی آ کر پڑی۔ تینوں دیوار سے چمٹ کر

کھڑے ہو گئے۔ پھر روشنی کے پیچھے سے ایک کرخت سی آواز آئی۔

''کون ہو تم لوگ؟''

اس کے ساتھ ہی کوئی شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کی طرف بڑھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹارچ اور دوسرے ہاتھ میں لمبی سی بندوق تھی!

یہ ایک بوڑھا شخص تھا اور بڑی مشکل سے قدم اُٹھا رہا تھا۔ عنبر، نسیم اور عاقِب بُت بنے اُس کو دیکھ رہے تھے۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد بوڑھا چلّایا۔ ''میں نے کہا، تم لوگ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

چیخ اور خاموشی

"کچھ نہیں جناب۔ ہم غار کے اندر یہ جاننے کے لیے آئے تھے کہ چیخنے کی آواز کس طرح پیدا ہوتی ہے۔" آخر عنبر نے بتایا۔

"اچھا! میں سمجھا کہ تم راستہ بھول گئے ہو۔" بوڑھے کا لہجہ اب نرم ہو گیا تھا۔ "دراصل شیرے ڈاکو کا غار ہے ہی بھُول بھلیّوں کی طرح۔ اگر تم خیریت چاہتے ہو تو آیندہ نہ آنا۔"

"ک۔۔۔ک۔۔۔کیا مطلب؟" نسیم نے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ یہ غار بہت پُراسرار ہے۔ یہاں بڑے میاں رہتا ہے۔ اور تم نے شاید سُنا ہو گا کہ بڑے میاں کوئی خوب صورت آدمی نہیں۔ اور میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں؟ بڑے میاں بچّوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی یہ غار بھُول بھلیّوں کی طرح پیچ در پیچ ہے۔ تم راستہ بھول جاؤ گے، چلو، میں تمہیں باہر لے چلتا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔“

یہ کہہ کر وہ مڑا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ عنبر نے عاقِب کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور تینوں بوڑھے کے پیچھے پیچھے غار سے نکل آئے۔ جب وہ سائیکلوں پر سوار ہونے لگے تو عنبر نے بوڑھے نے کہا۔ ”جناب، کا بہت بہت شکریہ۔ آپ باہر آنے میں مدد نہ دیتے تو شاید ہمیں واپسی کا راستہ اتنی آسانی سے نہ ملتا۔“

بوڑھے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اب اس نے رائفل کندھے پر لٹکا لی تھی۔ تم بڑے اچھے اور سمجھ دار لڑکے ہو۔ مگر میں نے تمہیں پہلے کبھی

نہیں دیکھا اس وادی میں۔“

”جی، ہم حال ہی میں یہاں آئے ہیں اور اسلم صاحب کے مہمان ہیں۔“ عنبر نے بتایا۔ ”جناب کا اِسم شریف؟“

”وہ کون ہے؟“

”میرا مطلب ہے، آپ کا نام؟“

”اچھا! میرا نام جبّار ہے۔ یہاں سب مجھے جانتے ہیں۔“

جبّار سے رُخصت ہو کر تینوں سُراغ رساں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہو گئے۔ ابھی وہ کچھ ہی دُور گئے تھے کہ عنبر نے ایک دم بریک لگائے۔ نسیم اور عاقِب کو بھی اُترنا پڑا۔ وہ دونوں سوالیہ نظروں سے عنبر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”تم جانتے ہو کہ سُراغ رساں بوڑھوں کے کہنے پر اپنے کام سے باز نہیں آ جاتے۔“ عنبر بولا۔ ”اس لیے ہم گھر کے بجائے واپس غار کی طرف جائیں

گے۔"

"لیکن وہاں تو وہ، جبّار صاحب۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"نسیم گڑبڑایا۔

"ظاہر ہے کہ ہم اُس راستے سے نہیں جائیں گے۔"عنبر بولا۔"میرا خیال ہے کہ اس غار میں جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہو گا، ورنہ وہ بوڑھا ایک دم ہمارے پیچھے نہیں آ سکتا تھا۔"

"تو پھر اب۔۔۔۔؟"عاقِب نے کہنا شروع کیا۔

"ٹھہرو! میرا خیال ہے، اس کا دوسرا راستہ سمندر کی طرف ہو گا۔ ہم اس چٹان کا چکّر کاٹ کر ساحل پر جائیں گے اور وہاں راستہ تلاش کریں گے۔"

"اگر کوئی ہوا تو؟"عاقِب بولا۔

"ہاں، یہ تو صرف میرا خیال ہے، جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔"عنبر مان گیا۔

"وہ بُوڑھا، یعنی جبّار کچھ عجیب سا آدمی تھا۔"عاقِب نے کہا۔

”آج ساری ہی باتیں عجیب و غریب ہو رہی ہیں۔“ نسیم نے کہا۔ ”شیرے ڈاکو کا غار دِن ڈھلے سے چیخ رہا تھا لیکن ہمارے اندر جاتے ہی اُس کو سانپ سونگھ گیا۔“

نسیم کی اس بات پر عاقِب اور عنبر کو ہنسی آ گئی۔ عنبر نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو اور وہ سیاہ اور چمکیلی چیز بھی جسے تم نے غار میں دیکھا تھا، کچھ کم عجیب و غریب نہیں۔“

”ہائے اللہ!“ نسیم نے کہا۔ ”اِس سنسان جگہ پر اُس پُراسرار شے کا ذکر نہ کرو۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ بڑے میاں ہی ہو گا۔“

”کاش میں اسے دیکھ سکتا۔“ عنبر نے کہا۔ ”بہر حال، اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر ساحل کی طرف چلنا چاہیے۔“

ساحل پر پہنچ کر اُنہوں نے سائیکلیں ایک طرف رکھیں اور پہاڑی کی طرف متوجّہ ہوئے۔

عنبر دائیں طرف والی چٹان میں راستہ تلاش کرنے لگا، عاقِب درمیان والے حصّے میں اور نسیم بائیں طرف والی چٹان میں۔

کوئی دس منٹ کے بعد عنبر اور عاقِب کو نسیم کی آواز آئی۔ ”مل گیا، مل گیا!“

ساحِل کے قریب گیلے پہاڑی سلسلے پر چلنا اِتنا آسان نہ تھا پھر بھی عنبر اور عاقِب تیزی سے نسیم کے پہنچ گئے۔ دو بڑے نوکیلے سے پتھّروں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا، جو بالکل تاریک نظر آ رہا تھا۔ یہ پتھّر سطحِ سمندر سے بمشکل ایک دو فٹ اُونچے تھے۔

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ واقعی اُسی غار کا راستہ ہے؟“ عاقِب نے کہا۔ ”ہمیں اندر جا کر دیکھنا پڑے گا۔“

”اندر تو ہم جائیں گے ہی۔“ عنبر نے کہا۔

”مگر اندر جائے بغیر بھی پتا چل رہا ہے کہ اس راستے کا تعلّق اِسی غار سے

ہے۔“نسیم نے کہا۔ ”اِدھر آؤ۔“

عاقِب اور عنبر راستے کے نزدیک گئے تو مدھم سی آواز سنائی دی۔

”آآآآآآآآہہہہہ۔۔۔اووووووووہہہہہہہ۔۔۔۔۔۔اووووووووووہہہہہہہہہ!“

غار پھر چیخنے لگا تھا!

گھوڑا!

”یہ راستہ تو بہت تنگ اور تاریک ہے۔“نسیم نے کہا۔

”مگر ہمیں اندر جانا ہو گا۔“عنبر نے کہا۔”عاقِب! یہ لو رسّی۔ اسے اپنی کمر کے گرد باندھ لو۔ اگر کوئی خطرناک بات ہوئی تو رسّی کو جھٹکا دے دینا تاکہ ہم تمہیں واپس کھینچ لیں۔“

”تو گویا میں اکیلا جاؤں گا اندر؟“ عاقِب نے کہا۔”میرا تو خیال تھا کہ ہم سب چلیں گے۔“

”سب کا ایک ساتھ اندر جانا مناسب نہ ہو گا۔ ہم یہاں کھڑے ہو کر تمہارے اشارے کا انتظار کریں گے۔“

عاقِب نے اللہ کا نام لے کر رسّی کا ایک سِرا کمر کے گرد باندھا اور روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ اتنا بڑا نہ تھا کہ وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس کے اندر جا سکتا۔ اس لیے وہ چاروں ہاتھ پیروں پر چل رہا تھا۔ راستہ سمندر کے پانی کے باعث گیلا بھی تھا اور اُس کے کناروں پر کائی اُگی ہوئی تھی۔ کوئی نو دس گز اسے اسی طرح جھکے جھکے چلنا پڑا۔ اس کے بعد راستہ ایک دم کھلا ہو گیا، اتنا کھلا کہ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر گھُما کر دیکھا۔ راستہ اوپر کی طرف جا رہا تھا اور بالکل خشک تھا، بالکل دوسری سمت والے راستے جیسا۔

عاقِب نے پیچھے مُڑ کر آواز دی۔ ”نسیم! عنبر! سب ٹھیک ہے۔ تم بھی آ جاؤ۔“ چند منٹوں میں نسیم اور عنبر بھی وہاں پہنچ گئے۔

”یہ جگہ بالکل خشک ہے۔“ نسیم نے کہا۔

"ہاں، یہ جگہ سطح سمندر سے خاصی اونچی ہے۔ اس لیے سمندر کی لہروں کا پانی یہاں تک نہیں آتا۔" عنبر نے بتایا۔ "آؤ، آگے چلیں۔"

کچھ آگے جانے کے بعد وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ اب پھر ایک گپھا میں پہنچ گئے ہیں، جہاں سے مختلف راستے مختلف سمتوں کو جارہے ہیں۔

" اللہ توبہ!" نسیم نے کہا۔ "یہ غار تو بہت ہی پُراسرار ہے۔ گپھائیں ہی گپھائیں!"

"ارے عنبر!" عاقِب نے عنبر کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "تم نے دیکھا؟"

"کیا؟" عنبر نے چاروں طرف ٹارچ گھُمائی مگر اسے کوئی نئی چیز نظر نہ آئی۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس بات پر تم نے غور کیا کہ جب سے ہم اندر آئے ہیں، غار نے پھر چیخنا بند کر دیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ہم غار میں داخل ہوتے ہیں تو چیخنے کی آواز

بند ہو جاتی ہے۔" عنبر نے کہا۔

"تب تو غار کا چیخنا بند کرانے کی مجھے ایک بڑی اچھّی ترکیب سُوجھی ہے۔" نسیم نے کہا۔

"کیا؟" عاقِب اور عنبر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم تینوں اس غار میں رہنے لگیں۔" نسیم نے اس انداز سے کہا کہ ان دونوں کو ہنسی آگئی۔

"یہ تو خیر مذاق کی بات تھی۔" نسیم بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اندر آتے ہیں تو یہاں کوئی تبدیلی ہوتی ہے جس سے آواز آنا بند ہو جاتی ہے۔"

عنبر نے کہا۔ "تمہارا خیال ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن دماغ میں ایک اور بات آ رہی ہے اور وہ یہ کہ غار میں داخل ہونے لگتے ہیں تو کوئی ہمیں دیکھ لیتا ہے اور پھر۔۔۔"

"لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کوئی واقعی ہمیں دیکھ لیتا ہے؟" عاقِب

نے سوال کیا۔

"بس، یہ میرا خیال ہے۔" عنبر نے کہا۔

"لیکن اس خیال کی کوئی وجہ یا بنیاد بھی تو ہونی چا۔۔۔۔"

نسیم کی بات درمیان ہی میں رہ گئی۔ کیوں کہ اُسی لمحے غار کے اندر گھوڑے کے چلنے کی آواز سنائی دی تھی، آواز اگرچہ مدھم تھی پھر بھی صاف سُنی جا سکتی تھی۔

"گھوڑا!" عنبر نے حیرت سے کہا۔ "یہ گھوڑے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟"

"غار کے اندر سے ہی آ رہی ہے؟" نسیم نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ بھاگ چلو۔"

"اگرچہ میں ڈر نہیں رہا۔" عنبر نے کہا۔ "لیکن پھر بھی تمہاری بات مجھے مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں باہر چلنا چاہیے کیوں کہ یہ گھوڑے والی

بات میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔"

چند منٹ بعد تینوں سُراغ رساں باہر ساحلِ سمندر کی ریت پر پڑے ہانپ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے آج ہم نے ضرورت سے زیادہ ہی تفتیش کر لی ہے۔" نسیم نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے ہمیں واپس ڈیری فارم چلنا چاہیے۔"

"واپس تو خیر ہم چلے ہی جائیں گے۔" عنبر نے کہا۔ "لیکن میں ابھی تک یہی سوچ رہا ہوں کہ غار کے اندر گھوڑا کہاں سے آ گیا!"

"میرا خیال ہے۔" عاقِب بولا۔ "ہم یہ بات ڈیری فارم جاتے ہوئے بھی سوچ سکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ آؤ چلیں۔"

تینوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہو کر ڈیری فارم طرف چل دیے۔ ابھی وہ

بھی سڑک پر آئے ہی تھے کہ عنبر نے سائیکل ایک دم روک لی۔ نسیم اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"اب کیا ہوا؟" نسیم نے پوچھا۔

عنبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے عنبر؟" عاقِب نے پوچھا۔

"ٹھہرو! میرا خیال ہے کہ میں نے پہاڑی کے اوپر کچھ دیکھا ہے۔" عنبر نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ؟" نسیم نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"سُنو!" عنبر نے کہا۔ "سننے کی کوشش کرو!" عاقِب اور نسیم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پہاڑی کے اُوپر کسی گھوڑے کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹَپ ٹَپ ٹَپ ٹَپ۔ دونوں نے غور سے دیکھا تو ایک گھوڑا نظر آیا۔ عنبر نے کہا۔ "عجیب بات ہے! گھوڑا پہاڑی کے اوپر چل رہا تھا اور آواز ہمیں

غار کے اندر آئی!"

گھوڑے کی آواز نزدیک آتی جا رہی تھی۔

"ہمیں چھپ جانا چاہیے۔" عاقِب نے کہا۔ "گھوڑا اِدھر ہی کو آ رہا ہے!"

تینوں سُراغ رساں جھاڑیوں کے پیچھے اس طرح چھُپ گئے کہ جب گھوڑا نزدیک سے گزرے تو اس کے سوار کو دیکھ سکیں۔ پانچ چھ منٹ بعد گھوڑا ٹَپ ٹَپ۔ ٹَپ۔ ٹَپ کرتا ہوا ان کے قریب سے گزرا۔

"ارے!" عاقِب نے کہا۔ "اس پر تو کوئی بھی سوار نہیں!"

"آؤ، اِسے پکڑ کر ڈیری فارم لے چلیں۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے اسے جانے دو۔ ہو سکتا ہے اس کا مالک پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔" عنبر نے کہا۔ "ہمیں چند منٹ اور انتظار کرنا چاہیے۔"

اُنہیں چپ ہوئے ایک دو منٹ ہی گزرے تھے جھاڑیوں کے قریب سے ایک آدمی گزرا۔ تینوں سُراغ رساں نے اسے غور سے دیکھ لیا۔ وہ

سانولے رنگ کا ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کی ناک خاصی لمبی تھی، دائیں گال پر ایک گہرے زخم کا نشان تھا اور دائیں آنکھ پر کالا کپڑا بندھا ہوا تھا۔

جب وہ دور چلا گیا تو نسیم نے کہا۔ ”توبہ ہے! مجھے تو یہ شخص کوئی بحری قزّاق لگتا ہے۔ تم نے اس کی آنکھ پر بندھا ہوا کالا کپڑا دیکھا؟“

”اور اس کے گال پر زخم کا نشان بھی تھا۔“ عاقِب نے کہا۔

”میں اس کے کپڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا لباس بالکل ایسا ہی تھا جیسا عام آدمی پہنتے ہیں۔ پھر اس کو آنکھ پر قزّاقوں جیسا کپڑا باندھنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟“ عنبر نے کہا۔

چند لمحوں بعد جب وہ سائیکلوں پر سوار ہو کر ڈیری فارم کی طرف جا رہے تھے تو اچانک سیاہ وادی میں پھر چیخ گونجی ”آآآآآآآآہہہہ۔۔۔۔۔ اووووووو۔۔۔۔ آآآآآآآآووووہہہہ!“

”چیختے رہو، بیٹا!“ نسیم نے کہا۔ ”اب تو ہم ڈیری فارم جا کر ہی سائیکل سے

اُتریں گے۔"

ہیرے

صُبح سویرے عاقِب کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کہیں اور لیٹا ہوا ہے! یہ بستر اس کا بستر نہیں تھا اور نہ یہ کمرا اس کا کمرا! وہ کہاں تھا؟

اُس کی سمجھ میں اچانک سب کچھ آ گیا۔ وہ سیاہ وادی میں اسلم صاحب کے ڈیری فارم میں سو رہا تھا۔ تب نے اپنے آس پاس دیکھا۔ نسیم بھی جاگ اُٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، لیکن عنبر کمرے میں موجود نہ تھا

”یہ عنبر کہاں چلا گیا؟“ عاقِب نے نسیم سے پوچھا۔

"شِی شِی!" نسیم نے منہ پر انگلی رکھ کا چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔

عنبر پلنگ پر نہیں، کمرے کے کونے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا، جیسے وہ چھوٹا سا مہاتما بدھ ہو۔ اس کے سامنے ایک کاغذ پھیلا ہوا تھا اور وہ اس پر جھک کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔

"بھئی، یہ کیا ہاتھی گھوڑے بنا رہے ہو صُبح صُبح؟" نسیم نے پوچھا۔

"غار کے راستوں کا خاکہ بنا کر دیکھ رہا ہوں۔" عنبر نے گردن اُٹھا کر کہا۔

"اچھا!"

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اندر جاتے ہی شیرے ڈاکو کا غار چیخنا کیوں بند کر دیتا ہے۔ دو دفعہ ہم غار میں گئے اور دونوں دفعہ ہی غار نے چیخنا بند کر دیا۔ لیکن ہر دفعہ، ہمارے باہر آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پھر چیخنا شروع کر دیا۔"

"میرا خیال ہے، اس مسئلے کا حل اِسی راز میں پوشیدہ ہے۔" عاقِب نے کہا۔

”ہاں، اگر ہم یہ معلُوم کر لیں کہ غار ہمارے اندر جاتے ہی کیوں خاموش ہو جاتا ہے تو ہم غار کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا سکتے ہیں۔“عنبر نے کہا۔

”کاش ہم ماسٹر ہوتے اور غار شاگرد! تب ہم ایک ہی منٹ میں غار کو خاموش کرا دیتے۔“ نسیم نے اس انداز سے کہا کہ سب کو ہنسی آ گئی۔

”تمہارا خاکہ کیا کہتا ہے؟“ عاقِب نے پوچھا۔

”اس خاکے کی مدد سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غار کے اوپر یا باہر کوئی شخص ہمیں غار کے اندر جاتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔“

”پھر تو اس کا علاج آسان ہے۔“نسیم نے کہا۔”ہم چچا اسلم کو بتائے دیتے ہیں کہ شیرے ڈاکو کے غار کے اوپر والی پہاڑی پر کوئی پُراسرار آدمی موجود ہے۔ پولیس کو ساتھ لے جائیں اور اسے پکڑا دیں۔“

”یہ کام اتنا آسان نہیں۔“عنبر نے کہا۔”اوّل تو ابھی ہمیں اس بات کا پورا یقین نہیں۔ اور پھر ہو سکتا کہ اسلم چچا کو یا تھانے دار کو اس بات کا یقین نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ جو آدمی پہاڑی کے اوپر ہوا تو وہ اتنا دُودھ پیتا بچّہ

نہیں ہو گا کہ پولیس جا کر اُسے پکڑ لے۔“

”پھر ہمیں کیا کرنا ہو گا؟“ نسیم نے پوچھا۔

”ہمیں فی الحال حالات کا پورا جائزہ لینا ہو گا۔ غار میں کیا ہو رہا ہے، یہ دیکھنا پڑے گا۔“ عنبر نے کہا۔ ”ہم پولیس کو بتا سکتے ہیں۔“

”مگر غار میں کیا ہو سکتا ہے؟“ عاقِب نے کہا۔

”میرے پاس ایک چیز ہے۔“ عنبر نے جیب سے کالا سا ایک پتھّر نکالتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے یہ اس راز کی چابی ہو کہ غار میں کیا ہو رہا ہے۔“

عاقِب اور نسیم نے باری باری پتھّر کو ہاتھ میں لے دیکھا لیکن اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔“

”یہ کیا ہے؟“ نسیم نے پوچھا۔ ”پتھّر ہی ہے نا؟ ایک عام سا پتھّر؟“

”اس سے اِس کھڑکی کے شیشے پر لکیر کھینچو۔“ عنبر نے کہا۔

نسیم سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور سیاہ پتھّر سے اُس کے شیشے پر چھوٹی سی

لکیر کھینچ دی۔ شیشہ اس جگہ سے کٹ گیا۔

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، یہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ تو ہیرا ہے!"

"ہاں، ہیرا۔ لیکن یہ بغیر ترشا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے بہت قیمتی نہ ہو۔ پھر بھی یہ ہیرا ضرور ہے۔"

"یہ تمہیں شیرے ڈاکو کے غار سے ملا ہے؟"

"ظاہر ہے۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس غار کے اندر ہیروں کی کان ہے؟" نسیم بڑبڑایا۔ اگر یہی خیال اُسے رات کو آجاتا تو شاید اسے خواب میں ہیرے ہی ہیرے نظر آتے رہتے۔

"یہ ضروری نہیں کہ غار میں ہیروں کی کان ہی ہو۔" عنبر نے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو حکومت کان پر قبضہ کر چکی ہوتی۔"

"پھر؟"

"بس، فی الحال تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" عنبر نے تسلیم کر لیا "لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ۔۔۔۔۔۔"

"چلو لڑکو! ناشتا تیّار ہے۔" اسلم صاحب کی بیگم نے دروازے پر آ کر ہانک لگائی۔

شاید تینوں سُراغ رسانوں کو بھوک بہت لگ رہی تھی، تبھی تو وہ منہ ہاتھ دھو کے جھٹ پٹ کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے اور مزے مزے سے ناشتا کرنے لگے۔

"بھئی خوب!" پروفیسر دُرّانی نے کہا۔ "سیاہ دادی کا چیخنے والا غار اور اس کی پُراسرار چیخ نے تمہاری بھُوک نہیں اُڑائی۔"

"جی نہیں۔" نسیم بولا۔ "بلکہ بڑھا دی ہے۔" یہ سُن کر سب ہنسنے لگے۔

"رات ساحل کی سیر کیسی رہی؟" پروفیسر نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی جَل پری تو سمندر میں نظر نہیں آئی؟“

”جل پری تو نہیں البتہ ایک بوڑھا بابا ضرور نظر آیا۔“ عنبر نے کہا۔ ”اور وہ ہمیں خاصا عجیب لگا۔ اس نے ہمیں اپنا نام جبّار بتایا تھا۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ کہتا تھا، یہاں سب لوگ اُسے جانتے ہیں۔“

”ہاں، یہاں اسے سب جانتے ہیں، پروفیسر نے کہا ہ وہ اور اس کا ساتھی تبریزی، دونوں سر پھرے آدمی ہیں۔ دراصل یہ دونوں کئی سال پہلے اس وادی میں آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں، پہاڑوں میں، سونے یا ہیرے جواہرات کی کانیں ہیں۔“ اسلم صاحب نے بتایا۔

”گُستاخی معاف۔“ عنبر نے کہا۔ ”کیا یہاں سچ مُچ کوئی کان نکلی؟“

”کان وان تو کیا نکلتی۔“ اسلم صاحب نے بات باری رکھتے ہوئے کہا ”البتہ جبّار اور تبریزی اپنی تلاش سے باز نہیں آئے اور باز آنے کو تیار بھی نہیں ہیں۔ وہ چند دن محنت مزدوری کر کے مہینے بھر کے کھانے کا بندوبست کر لیتے ہیں اور اس کے بعد کئی کئی دن پہاڑوں میں سر پھوڑتے رہتے ہیں۔“

”ویسے دونوں ہی سر پھرے ہیں۔“ پروفیسر دُرّانی نے کہا۔ ”جیسے مثل تم نے سنی ہو گی، اللہ نے ملائی جوڑی، ایک، اندھا، ایک کوڑھی۔“

ابھی وہ سب ہنس ہی رہے تھے کہ حفیظ تیز تیز قدم رکھتا اندر آیا۔ ”صاحب! دومزدور رفیق کو وادی میں سے اُٹھا کے لائے ہیں۔“

”اٹھا کے؟“ اسلم صاحب نے کُرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا اسے؟“

”پتا نہیں، جناب۔“ حفیظ نے کہا۔ ”رات، کسی وقت، وہ گھوڑے پر سے گر پڑا اور رات بھر وہاں پڑا رہا۔ صُبح کو مزدوروں نے اُسے وہاں بے ہوش دیکھا۔“

”اب کیسا ہے؟“

”اب اسے ہوش آ گیا ہے، البتّہ جسم میں دیر محسوس کر رہا ہے۔“

”اچھا، تم چلو۔ میں اُسے دیکھنے آتا ہوں۔ ضرورت ہوئی تو اُسے مہرپُور کے

ہسپتال میں لے چلیں گے؟"

"وہ جی۔۔۔۔" حفیظ ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر عجیب سے کرخت لہجے میں کہنے لگا۔ "دو اور آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بھی اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔ وہ ایسے پُراسرار حالات میں کام نہیں کرنا چاہتے۔"

"تم۔۔۔۔۔ تم اُنہیں سمجھاؤ!" اسلم صاحب نے کہا۔

"میں کیسے سمجھاؤں، جناب۔" حفیظ نے کہا۔ "رفیق ہوش میں آیا تو وہ دونوں مزدور وہیں تھے۔ جب ہم نے رفیق سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا تو اُس نے کہا کہ اُسے ایک عجیب سی شے نظر آئی تھی جس نے اس کے گھوڑے پر جادُو سا کر دیا جس سے وہ نیچے گِر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔"

اسلم صاحب اور اُن کی بیگم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عنبر نے کہا۔ "کیا ان کا گھوڑا کالے سے رنگ کا تھا؟"

"ہاں۔ آپ نے یہ گھوڑا کہاں دیکھا تھا؟"

”جب ہم کل رات گھر واپس آرہے تھے تو اس گھوڑے کو سوار کے بغیر پہاڑی پر چلتے دیکھا تھا۔“

”اوہو!“ اسلم صاحب نے کہا۔ ”اگر تُم اُسی وقت اس بات کا ذکر کر دیتے تو رفیق رات بھر وہاں بے ہوش پڑا نہ رہتا۔“

”ہمیں پتا نہ تھا۔“ عنبر نے کہا۔ ”آئندہ ایسا اتّفاق ہوا تو یاد رکھیں گے۔“ پھر ایک لمحہ ٹھٹک کر بولا۔ ”اصل میں ہوا یوں کہ اس کے پیچھے، تھوڑے سے فاصلے پر ایک لمبا تڑنگا آدمی آرہا تھا، جس کے گال پر ایک زخم کا نشان تھا اور اس نے دائیں آنکھ پر کالا کپڑا لگایا ہوا تھا۔“

”زخم کا نشان؟“ اسلم صاحب نے دُہرایا۔ ”دائیں آنکھ پر کالا کپڑا؟ میں نے تو ایسے کسی آدمی کو یہاں نہیں دیکھا۔“

”بہر حال، ایک بات تو طے ہے۔“ پروفیسر دُرّانی نے کہا۔ ”وہ آدمی جو تم نے رات وہاں دیکھا تھا شیر اڈا کو نہیں تھا۔“

"اچھا حفیظ، تم چلو۔ میں آتا ہوں۔ میں راستے میں تھانیدار کو بھی اس آدمی کے بارے میں اطلاع دیتا جاؤں گا جسے بچّوں نے رات دیکھا ہے۔" اسلم صاحب نے کہا۔

"چچا جان، آپ جیپ میں جا رہے ہوں تو مجھے بھی لے چلیے۔ مجھے گھر جانا ہے۔" عنبر نے کہا۔

"گھر؟ اپنے گھر؟ کیوں؟ کیا ہوا؟" اسلم صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

عنبر نے کہا۔ "میں اپنا غوطہ خوری کا سامان لاؤں گا۔ یہاں سمندر میں غوطہ خوری کر کے سمندری جڑی بوٹیاں اکٹھی کریں گے۔"

"بیٹے، میرے پاس تو اتنا وقت نہیں۔" اسلم صاحب نے کہا۔ "میں داؤد سے کہوں گا کہ وہ تمہیں لے جائے اور پھر واپس بھی لے آئے۔"

عنبر اسلم صاحب کے جاتے ہی وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور عاقِب اور نسیم کو آنے کا اشارہ کر کے کمرے میں چلا گیا۔

”میں یہ چاہتا ہوں۔“ اس نے دونوں سے کہا۔ ”کہ تم چچی سے اجازت لے کر آج مہرپُور چلے جاؤ۔ وہاں میلا لگا ہوا ہے۔“

”ہم یہاں میلا دیکھنے اور غوطہ خوری کرنے آئے ہیں؟“ عاقِب کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ عنبر کیسی باتیں کر رہا ہے۔

”نہیں۔ تم میلے میں ایک کام سے جاؤ گے۔“ عنبر نے کہا۔ ”بلکہ دو تین کاموں سے۔“

”کہو!“

”ایک تو وہاں سے تین ربڑ کے پُتلے لانا جو پھُونک بھر کر آدمی کے سائز کے ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا۔“

”اور ایک درجن بڑی سفید موم بتّیاں لانا۔ تیسرا کام یہ ہے کہ پبلک لائبریری جانا اور سیاہ وادی کے بارے میں جو کام کی معلومات کسی بھی

کتاب میں مل سکیں لے آنا۔"

تھوڑی دیر بعد داؤد عنبر کو شہر لے گیا تاکہ وہ اپنے گھر سے غوطہ خوری کا لباس لا سکے۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد عاقِب اور نسیم مہرپُور چل پڑے۔ مہرپُور زیادہ دور نہ تھا۔ اُنہوں نے سائیکلیں پکڑیں اور وہاں کی راہ لی۔

جب مہرپُور کے قریب پہنچ گئے تو قریب کی جھاڑیوں سے ایک گھُڑسوار اُن کی طرف بڑھا۔ اس نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے، اور منہ پر سیاہ نقاب ڈالا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا جس کا رُخ لڑکوں کی طرف تھا۔

عاقِب اور نسیم لرز گئے!

یہ شیر اڈا کو کہاں سے اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا؟

حادِثہ

اس سے پہلے کہ نسیم اور عاقِب کوئی حرکت کرتے، شیرے نے ہنستے ہوئے اپنا نقاب اتار دیا اور پستول جیب میں ڈال لیا۔

یہ ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا تھا، جو نسیم اور عاقِب کو ڈرا کر اب خوب ہنس رہا تھا۔ اس نے اُنہیں بتایا کہ مہرپُور کے میلے میں شیرے ڈاکو جیسا لباس عام ملتا ہے اور لڑکے بالے اسے پہن کر ایک دوسرے کو ڈراتے پھرتے ہیں۔

”جب تم میلے میں جاؤ گے تو تمہیں کم از کم دس پندرہ شیرے ڈاکو وہاں

گھومتے ملیں گے۔" لڑکے نے اُنہیں بتایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" نسیم نے کہا۔ "لیکن رات کو میں کسی شیرے ڈاکو کو دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ دِن میں کوئی حرج نہیں۔"

"ہم شام پڑنے سے پہلے میلے سے واپس آ جائیں گے۔" عاقِب نے کہا۔ مہر پُور پہنچ کر اُنہوں نے اپنی سائیکلیں پبلک لائبریری کے سائیکل اسٹینڈ پر رکھیں اور لائبریری چلے گئے۔

"پہلے ہم یہاں سے سیاہ وادی اور شیرے ڈاکو کے غار کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ اس کے بعد پُتلے اور موم بتّیاں وغیرہ لینے چلیں گے۔" عاقِب نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ لائبریری کے ریڈنگ روم داخل ہوتے، ایک آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتا آیا اور لائبریری میں چلا گیا۔ یہ خاصی بڑی لائبریری تھی۔ جب عاقِب اور نسیم اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو وہ شاید کسی اور کمرے میں جا چکا تھا۔

ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیوں کہ وہ آدمی جو لائبریری میں داخل ہو کر غائب ہو تھا، وہی تھا جس کے دائیں گال پر زخم کا گہرا نشان تھا اور جس نے کل رات اپنی دائیں آنکھ پر کالا کپڑا الٹکا رکھا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھ پر کپڑا نہ تھا لیکن نسیم اور نے اس کے گال کے زخم سے پہچان لیا تھا۔

مگر اب کیا کِیا جا سکتا تھا، اب تو وہ پُراسرار آدمی لائبریری کے اندر کہیں غائب ہو چکا تھا! فی الحال اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ یہیں کمرے میں بیٹھ کر سیاہ وادی اور شیرے ڈاکو کے غار کے بارے میں کسی کتاب میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اس طرح وہ کسی پر ظاہر کیے بغیر، اُس شخص کا انتظار بھی کر سکتے تھے۔ آخر اسے یہیں سے گزر کر باہر جانا تھا۔

نسیم اور عاقِب نے لائبریری کے ملازم کو بتایا کہ انہیں کس قسم کی کتاب چاہیے۔ وہ آدمی ایک الماری میں سے دو تین کتابیں نکال کر لے آیا۔ نسیم اور عاقِب کتابیں لے کر کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

"میں کتاب دیکھتا ہوں۔" عاقِب نے کہا۔ "اور تم اس آدمی کا دھیان رکھنا۔ اگر وہ نکلا تو تم کسی بہانے سے اس کے پیچھے پیچھے چل دینا۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"یہ ترکیب ٹھیک ہے۔" نسیم نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "تم اب مطالعے میں مصروف ہو جاؤ۔ میں انتظار رہتا ہوں۔"

اُسی لمحے ایک آدمی لائبریری کے اندر والے کمرے سے آیا۔ اسے دیکھ کر نسیم نے عاقِب سے کہا۔ "پروفیسر دُرّانی!"

پروفیسر سیدھا اُنہی کی طرف آیا اور کہنے لگا "آخّاہ! ننّھے سُراغ رساں تحقیق کر رہے ہیں۔"

"ج۔۔۔۔۔ جی ہاں۔" عاقِب نے کہا۔ "ہم سیاہ وادی اور شیرے ڈاکو کے غار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"خُوب!" پروفیسر نے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے آنکھیں جھپکاتے

ہوئے کہا۔ ”بہت خوب۔ میں بھی اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ میری کتاب اب ختم ہونے کو ہے۔ مجھے اُمّید ہے کہ تم لوگوں کو بہت پسند آئے گی۔“

”آپ تو روزانہ یہاں آتے ہوں گے۔“ نسیم نے کہا۔

”نہیں۔ روز تو نہیں، البتّہ ہفتے میں دو تین مرتبہ یہاں آتا ہوں اور دو تین دِن اسلم صاحب کے گھر کمرے میں بند ہو کر اُن معلومات پر غور کرتا ہوں جو یہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔“ پروفیسر دُرّانی نے کہا۔ ”تم لوگ کس طرح آئے ہو؟“

”سائیکلوں پر۔“ نسیم نے کہا۔

”جناب۔“ عاقِب نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ نے لائبریری میں ایک لمبے سے آدمی کو داخل ہوتے تو نہیں دیکھا؟ اس کے گال پر زخم کا نشان ہے۔“

پروفیسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا مطلب اُس آدمی سے ہے جو تم

نے رات پہاڑی پر دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تم نے اسے یہاں دیکھا ہے؟"

"جی جناب۔" نسیم نے کہا۔ "ہم سائیکلیں سٹینڈ پر رکھ کر لائبریری میں اندر داخل ہونے ہی والے تھے کہ وہ آدمی بھاگ کر اندر داخل ہوا اور پھر کہیں غائب ہو گیا۔"

"یہ بات تو تمہیں میرے آتے ہی بتانا چاہیے تھی۔" پروفیسر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے جب ہم باتیں کر رہے تھے تو وہ شخص آنکھ بچا کر نکل گیا ہو۔"

پروفیسر دُرّانی صحیح کہہ رہے تھے۔ جب یہ لوگ باتیں کر رہے تھے تو نسیم کا دھیان بھی باتوں میں لگ گیا تھا اور وہ اُس آدمی کا دھیان نہ رکھ سکا تھا۔

"تمہیں اس کے بارے میں چوکنّا رہنا چاہیے تھا۔" پروفیسر نے کہا۔ "اب اگر تمہیں وہ شخص نظر آ جائے تو اس کا دھیان رکھنا اور دیکھنا کہ وہ کس

آدمی سے ملتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔"

"یہ تو ہم کریں گے ہی۔" عاقِب نے کہا۔ "کاش! وہ ہمیں ایک دفعہ مل جائے۔"

"اچھا، میں چلتا ہوں۔ میں کافی دیر سے اندر پڑھ رہا تھا۔ اب میلے میں تھوڑی سی سیر کر کے واپس چلا جاؤں گا۔" پروفیسر نے کہا۔

پروفیسر دُرّانی کے جانے کے بعد عاقِب اور نسیم کتابیں دیکھنے لگے۔ ان سے اُنہیں کوئی خاص معلومات حاصل نہ ہوئیں۔ اس کے بعد وہ کتابوں کی ایک الماری کے پاس کھڑے ہو کے کتابوں کے نام دیکھنے لگے۔ اس الماری میں اُنہیں ایک کتاب کام کی مل گئی۔ اس کا نام تھا "سیاہ وادی کی تاریخ۔" یہ کتاب غلط الماری میں رکھی ہوئی تھی اس لیے اُنہیں لائبریری کے مُلازم نے نہیں دی۔ عاقِب نے اسے جگہ جگہ سے پڑھا اور پھر کارڈ پر جاری کرا لیا جو وہ اسلم صاحب کی بیگم سے مانگ کر لایا تھا۔ بیگم صاحبہ لائبریری کی ممبر تھیں۔

اب نسیم اور عاقِب لائبریری سے باہر آ گئے اور میلے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ لوگ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ٹولیوں کی شکل میں ناچ گا رہے تھے اور کہیں ایک دو شیرے ڈاکو گھوم رہے تھے۔

یکایک نسیم نے عاقِب سے کہا۔ ”جبّار! وہ دیکھو۔“

عاقِب نے دیکھا۔ دو آدمی ایک دُکان پر کھڑے کُچھ خرید رہے تھے۔ یہ لوہے کے سامان کی دُکان تھی۔

”یہ جبّار کے ساتھ اور کون ہے؟“ عاقِب نے کہا۔

”یہ تبریزی ہو گا۔“ نسیم بولا۔ ”جبّار کے ساتھ تبریزی ہی ہو سکتا ہے۔“

”کیا ہمیں اِن کا پیچھا کرنا چاہیے؟“ عاقِب نے کہا۔

”اونہوں۔“ نسیم بولا۔ ”ان کا پیچھا کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ ہمارے کیا کام آ سکتے ہیں۔“

اُنھوں نے گھوم پھِر کر ضروری سامان خریدا اور واپس روانہ ہو گئے۔ اب وہ ڈیری فارم سے کوئی ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھے۔ وہاں سے انہیں دائیں طرف، ذرا دُور، سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ نیلا نیلا سمندر۔ اس وقت دُھوپ نکلی ہوئی تھی اس لیے اُنہیں ساحل سے پرے اور سمندر میں کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آ رہے تھے۔

"کسی دِن اِن جزیروں میں سے کسی ایک پر پکنک منانی چاہیے۔" نسیم نے کہا۔

"مگر پہلے ہم سیاہ وادی کے چیخنے کی آوازیں بند کرا دیں یا کم از کم ان کا راز کھول دیں۔" عاقِب نے کہا۔ "بزرگوں نے کہا ہے، پہلے کام، پھِر آرام۔"

"چلو، بعد میں سہی۔" نسیم نے کہا۔ "کتنا مزا آئے گا وہاں کھُلی فضا کھلی ہوا۔ چاروں طرف گہرا نیلا سمندر۔ پانی ہی پانی۔"

"بس، اب تم چلتے چلتے خواب نہ دیکھنے لگنا۔" عاقِب نے کہا۔ "سڑک اُونچی ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا دھیان سے چلو، ایسا نہ ہو کہ نیچے گِر پڑو۔"

”میں دھیان ہی سے چل رہا ہوں۔“ نسیم نے کہا۔

”اُسی لمحے پیچھے سے ایک کار کی آواز آئی۔

سڑک بُہت چوڑی نہ تھی، اس لیے عاقِب اور نسیم سائیکل سے اُتر کر کنارے پر ہو گئے تا کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔

لیکن کار بڑی بے احتیاطی سے آ رہی تھی۔ جدھر نسیم اور عاقِب کھڑے تھے، اُدھر ہی کو اُس نے ایک جھٹکا سا کھایا۔ اگر نسیم اور عاقِب وہیں کھڑے رہتے تو شاید کار کے نیچے کُچلے جاتے۔

اُنھوں نے ایک ایک قدم پیچھے ہٹایا اور کار کی زد سے نکل گئے۔ لیکن اب وہ سڑک پر نہیں کھڑے تھے۔ سڑک نیچے گہرائی میں گِرتے جا رہے تھے۔

انوکھی ترکیب

بہت گہرائی تھی۔ اگر وہ سیدھے گِرتے تو شاید زندہ نہ بچتے، لیکن وہ لڑھکتے ہوئے آرہے تھے اور پودوں اور شاخوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے، اس لیے ان کی رفتار کچھ ہلکی ہو گئی۔

"کھٹاک!" نسیم ایک درخت کی شاخوں پر پڑا۔ "اُف" وہ چلّایا۔ "اووووف!" اس کی قمیض کئی جگہ سے پھٹ گئی اور نیچے آتے آتے اسے بہت سی خراشیں آگئی تھیں۔ عاقِب اُسے کہیں نظر نہ آیا۔

نسیم نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں اور پھر سر کو جھٹکا دے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ”عاقِب! عاقِب! کہاں ہو تم؟“

”اِدھر پانی میں۔“ عاقِب کی مدھم سی آواز نیچے سے آئی۔ ”میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ تم کہاں ہو؟“

”میں ایک درخت پر بیٹھا ہوا ہوں۔“ نسیم نے کہا۔ ”مگر تم مجھے ابھی تک نظر نہیں آئے۔“ جلد ہی عاقِب نسیم کو نظر آ گیا۔ وہ اُس درخت سے ذرا فاصلے پر، نیچے ایک پہاڑی چشمے میں، بیٹھا ہوا تھا۔

”میری ٹانگ۔“ عاقِب نے کہا۔ ”میری ٹانگ شاید میرے نیچے گرتے وقت مُڑ گئی ہے۔ اس میں درد ہو رہا ہے۔“

”ہمّت سے کام لو۔“ نسیم نے کہا۔ ”ٹھہرو! میں نیچے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُوورف!“

”رُک جاؤ!“ عاقِب چلّایا۔ ”اُوپر دیکھو جلدی سے!“

نسیم نے فوراً اوپر دیکھا۔ وہاں، سڑک کے کنارے، وہی لمبا آدمی کھڑا تھا اور اُنہیں جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دائیں گال پر زخم کا بڑا سا نشان تھا اور اب اس کی دائیں آنکھ پر کالا کپڑا بھی بندھا ہوا تھا۔

چند لمحے اُس شخص نے نسیم اور عاقِب کو گھور کر دیکھا، پھر چلا گیا۔ نسیم اور عاقِب کو پہلے کار کے انجن سٹارٹ ہونے کی آواز آئی، اور پھر کار کے جانے کی۔

"اس نے ہمیں لائبریری میں دیکھا ہو گا اور وہیں سے ہمارے پیچھے لگ گیا ہو گا۔"

"عجیب بات ہے! پیچھا تو ہم اُس کا کرنا چاہتے تھے اور یہ کرنے لگا ہمارا۔"
"ہمیں مدد کے لیے چلّانا چاہیے۔"

"ہاں، میرا خیال ہے کہ ہم صرف اپنی ہمّت سے ڈیری فارم نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے تو تمہاری ٹانگ کی فکر ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ ٹانگ صرف مُڑ گئی ہے۔ ذرا سی مالش ٹھیک ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے ہمیں اب مدد لیے پکارنا چاہیے۔" اور وہ دونوں زور زور سے چلّانے لگے۔

"مدد۔۔۔۔۔ مدد!"

سڑک پر جاتے ہوئے ایک دو آدمیوں نے ان کی آواز سُن لی۔ یہ لوگ تانگے میں جا رہے تھے۔ اُنہوں نے ان دونوں کو وہاں نکالا اور تانگے میں بٹھا کے ڈیری فارم چھوڑ آئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اسلم صاحب کی بیگم چلّائیں "یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے! خیریت تو ہے؟"

"گھبراؤ نہیں، بیگم۔" اسلم صاحب نے کہا۔ "پہلے اُنہیں آرام سے بٹھاؤ اور پھر انہیں گرما گرم چائے پلاؤ۔ میں ان کی ہڈّی پسلی دیکھتا ہوں۔"

چوٹیں زیادہ نہ تھیں۔ خدا نے بہت کرم کیا تھا۔

”آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے ؟“ اسلم صاحب نے پوچھا ”کیا تم لوگ۔۔۔۔“

”ٹھہریے، چچا جان۔“ عاقِب بولا۔ ”میں بتاتا ہوں۔ کل جس آدمی کا ذکر ہم نے کیا تھانا، یہ سب اُسی کا کیا دھرا ہے۔“

”قادِر کا؟ وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔“

”قادِر نہیں۔“ نسیم نے کہا۔ ”وہ لمبا آدمی جسے ہم نے رات گھوڑے سے کچھ فاصلے پر دیکھا تھا اور جس کے ایک گال پر۔۔۔۔۔۔“

”گہرے زخم کا نشان تھا اور جس کی آنکھ پر کالا کپڑا لٹکا ہوا تھا۔“ اسلم صاحب نے فقرہ مکمّل کر دیا۔

”جی ہاں، وہی آدمی۔“

”پوری بات بتاؤ۔ مجھے تھانے دار کو بتانا ہو گا، کیوں کہ اُس کے خیال میں اس قسم کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہتا۔ میں نے آج صُبح ہی اس آدمی کا ذکر اس سے کیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔“

"ہم مہر پُور کے میلے سے سائیکلوں پر سوار واپس آ رہے تھے۔۔۔" اور عاقِب نے سارا قصّہ، پُوری تفصیل سے، اسلم صاحب کو سُنا دیا۔

"کیا تم نے اس کار کا نمبر دیکھا تھا؟" اسلم صاحب نے پوچھا۔

"نہیں۔" نسیم نے کہا۔ "نمبر دیکھنے کی مُہلت ہی نہیں ملی۔"

"البتّہ ایک چیز میں نے دیکھی تھی۔" عاقِب نے کہا۔ "اس کار کی نمبر پلیٹ کالی اور سفید کے بجائے زرد اور سُرخ تھی۔"

اسلم صاحب نے چند لمحے غور کیا اور پھر بولے۔ "سمجھ گیا۔ بعض کاروں پر جو کراچی کی ہوتی ہیں، نمبر پلیٹ زرد رنگ کی ہوتی ہیں اور نمبر سُرخ رنگ کا لکھا ہوتا ہے۔ وہ اِسی قسم کی کار ہو گی۔"

"جی۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔"

"مگر جہاں تک میں جانتا ہوں اسی قسم کی نمبر پلیٹ والی کوئی کار سیاہ وادی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اچھّا خیر، تم لوگ شام ایک آرام کرو۔ میں

تھانے جاتا ہوں۔"

"رفیق اب کیا ہے؟" نسیم نے پوچھا۔

"اب ٹھیک ہے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر گھوڑے سے گِرا تو وادی چیخ رہی تھی۔ وہ اس چیخ سے خوف سے بے ہوش ہو گیا۔ چُوں کہ رات بھر وہاں پڑا رہا اس لیے اس کے جسم میں درد ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، ایک دو دِن آرام کرے۔" اُسی لمحے عنبر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا جس نے غوطہ خوری کا لباس اور ایک پوٹلی اُٹھا رکھی تھی۔ عنبر نے اُس آدمی سے کہا۔ "یہ سامان یہیں رکھ دو۔ شکریہ۔"

"ارے! یہ کیا ہوا؟" عنبر نسیم اور عاقِب کو دیکھتے ہی چلّایا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" نسیم نے کہا۔ "سب خیریت ہے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ ابھی بتاتے ہیں۔"

اور حبیب اسلم صاحب اور اُن کی بیگم چلے گئے تو عاقِب نے کہا۔ "نمبر

ایک !اس پتھّر کا کیا نتیجہ نکلا؟“

”وہ ہیرا ہی ہے۔ مگر تمھیں کیسے پتا چلا کہ میں اس کے بارے میں بھی پتا لگانے گیا تھا؟“

”ہم بھی تو آخر سُراغ رساں ہیں۔“ عاقِب نے کہا۔ ”خیر یہ تو پتا چل گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ آئندہ کے لیے کیا تجویز ہے؟“

”پہلے تم مجھے پُورا قصّہ سُناؤ۔ پھر تجویز کا ذکر ہو گا۔“ عنبر بولا۔

قصّہ سُننے کے بعد عنبر ہونٹ مسلتے ہوئے بولا۔ ”اُس کا نمبر تو تم نہیں دیکھ سکے ہو گے؟“

”نہیں۔“

”اور تم کہتے ہو کہ زخم کے نشان والے آدمی نے تمھیں اُوپر سے جھانک کر بھی دیکھا تھا؟“

”ہاں شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو گیا یا

نہیں۔"

"اور تم نے لائبریری میں بھی اُسے دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ لیکن اس وقت اس کی دائیں آنکھ پر کپڑا نہیں تھا۔"

"اور تُم نے لائبریری میں پروفیسر دُرّانی کو بھی دیکھا تھا؟"

"بالکل۔"

"حالات بہت پُراسرار ہیں۔" عنبر ہونٹ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔
"خیر، تم کتاب لائے ہو کوئی؟"

"ہاں۔ یہ رہی۔" عاقِب نے کتاب دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اب تم آرام کرو۔" عنبر نے کہا۔ "میں اس میں سے ضروری ضروری باتیں دیکھ لیتا ہوں۔ ہم آج پھر شیرے ڈاکو کے غار میں چلیں گے۔"

"تم نے اپنی تجویز نہیں بتائی کہ کیا کرو گے؟"

”بس تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔“عنبر نے کہا۔”ذرا میں یہ کتاب دیکھ لوں۔“

کوئی ایک گھنٹے بعد عنبر کتاب بند کرتے ہوئے بولا”میرا خیال ہے تھوڑا سا جواب ہمیں اس کتاب میں مل گیا ہے۔“

”کیا؟“نسیم نے چونک کر پوچھا۔

”اس میں لکھا ہے کہ پچاس سال پہلے شیرے ڈاکو کے غار میں غائب ہو جانے کے کچھ عرصے بعد اعلیٰ حکّام موقع پر آئے اور اُنہوں نے غار کے کچھ راستے بند کرا دیے۔ ایسے راستے جہاں اُنہیں شیرے ڈاکو کے چھُپنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ تب یہ چیخنے کی آواز غار میں سے آنا بند ہو گئی تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اب اتنے عرصے کے بعد کسی نے اُن میں سے کوئی بند راستہ کھول لیا ہے جس کے باعث ہوا وہاں سے گُزرنے لگی ہے اور چیخنے کی آواز پھر سے آنے لگی ہے؟“ عاقِب نے کہا۔

”ہاں، یہ بات ممکن ہے۔“ عنبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔”ہو سکتا ہے

آج رات ہم غار کے چیخنے کا راز پالیں۔ میرے نزدیک آ جاؤ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کیا کریں گے۔" عاقِب اور نسیم اُس کے نزدیک کھِسک آئے۔

"ہم دُشمن کو دھوکا دیں گے؟"

"دُشمن؟"

"ہاں، جو کوئی بھی دُشمن ہو۔ غار ہو یا کوئی انسان جنگ میں فوجی کسی جگہ پر بہت ساری آگ جلا دیتے ہیں۔ جس سے دُشمن یہ سمجھتا ہے کہ فوج یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور فوج چکّر کاٹ کر اچانک اس پر حملہ کر دیتی ہے۔ ہم یہی کرنے جا رہے ہیں۔"

عاقِب اور نسیم کے کچھ پلّے نہ پڑا۔ ان کے چہروں سوالیہ نشان دیکھ کر عنبر نے کہا۔ "ہم اپنے دُشمن کو دھوکا دے کر غار کے اندر جائیں گے۔"

اب عاقِب اور نسیم کی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ

ہم اس طرح غار کے اندر جائیں گے کہ اگر پہاڑی کے اُوپر کوئی شخص دیکھ رہا ہو تو اُسے ہمارے اندر جانے کا پتا نہ چلے۔" عاقِب نے پُوچھا۔

"بالکل۔" عنبر نے کہا۔ "بس، اس سے آگے میں تمھیں وہیں چل کر بتاؤں گا۔"

"ہمیں اپنے ساتھ کیا کیا لینا ہو گا؟" نسیم نے پوچھا۔

"غوطہ خوری کا لباس، موم بتّیاں پُتلے اور وہ پوٹلی جو میں لایا ہوں۔"

"اُس پوٹلی میں کیا ہے؟" نسیم نے پوچھا۔

"یہ بھی وہیں چل کر بتاؤں گا۔ اصل میں مَیں اِحتیاط سے کام لینا چاہتا ہوں۔ ایک سُراغ رساں کو ہر قدم پھُونک پھُونک کر رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہم کب چل رہے ہیں؟" عاقِب نے پوچھا۔

"شام سے ذرا پہلے۔ ایسے وقت جب سُورج ڈھلنے کے قریب ہو۔"

اسلم صاحب کی بیگم نے لڑکوں کے لیے چائے تیّار کر دی تھی۔ چائے پینے

کے بعد وہ تیّاریوں میں مصروف ہو گئے اور پھر جلد ہی سائیکلوں پر سوار ہو کر چل پڑے۔

تینوں سراغ رساں کچّی سڑک سے آگے پہنچ گئے تو اُنہوں نے ایک جگہ سائیکلیں کھڑی کر دیں۔ پھر اُنہوں نے غوطہ خوری کا سامان اور پوٹلی اُٹھائی اور جھاڑیوں میں چھُپ گئے۔ وہاں عنبر نے پوٹلی کھولی۔ اس میں سے ربڑ کے پُتلے اور کچھ کپڑے نکلے۔

"اب ان پُتلوں میں ہوا کریں گے۔" عنبر نے کہا۔ "پھر اپنے کپڑے اُنہیں پہنا دیں گے۔ پوٹلی والے کے خود پہن لیں گے۔ اس طرح ہم ان پُتلوں کو اپنی جگہ چھوڑے جائیں گے اور خود غوطہ خوری کا لباس پہن لیں گے۔ اب جو کوئی بھی پہاڑ کے اوپر بیٹھا ہو گا وہ غوطہ خوروں پر توجّہ نہ دے گا بلکہ پُتلوں کو سُراغ رساں سمجھے گا اور انہی کو دیکھتا رہے گا۔"

"لیکن پُتلے تو چُپ چاپ پڑے رہیں گے۔" نسیم نے کہا۔ "اس آدمی کو شُبہ نہ ہو گا؟"

”ایک پُتلا ہِلے گا۔“عنبر نے کہا۔

”وہ کیسے ؟“نسیم نے پوچھا۔

”وہ ایسے کہ میری اور تمہاری جگہ تو پُتلے بیٹھیں گے۔ اور عاقِب کی جگہ خود عاقِب بیٹھے گا۔ وہ جھُوٹ موٹ نسیم اور عنبر سے باتیں کرتا رہے گا تاکہ اگر کوئی آدمی اُوپر سے دیکھ رہا ہو تو اسے شُبہ نہ ہو۔“

”خوب! یہ تو بہت اچھی ترکیب ہے!“نسیم بولا۔”اس طرح ہم غوطہ خوری کا لباس پہن کر سمندر میں جائیں گے اور وہاں سے پانی کے نیچے ہی نیچے غار کے دوسرے منہ کی طرف چلے جائیں گے۔“

”تو گویا تم دونوں غار کے اندر اِس طرح پہنچنا چاہتے ہو کہ غار کو پتا نہ چلے۔“عاقِب نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

”بالکل۔“ عنبر نے کہا۔”میرا خیال ہے اگر ہم اِس طرح غار کے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے تو غار کل کی طرح ہمارے اندر جاتے ہی چیخنا بند

نہیں کرے گا۔"

"اور یُوں ہم غار کے چیخنے کا راز معلوم کرنے میں کام یاب ہو جائیں گے۔" نسیم نے کہا۔

اُسی لمحے غار کی آواز ایک دردناک چیخ کی صورت میں وادی میں گونجی۔

"آآآآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔اووووووو۔۔۔۔۔اووووہہہہ۔۔۔۔۔۔!"

"آج ہم اس کی چیخیں بند کر کے ہی رہیں گے۔" عنبر نے مُسکراتے ہوئے کہا۔"اب جلدی سے پُتلے تیّار کرو۔"

شیر اڈاکو

نسیم اور عنبر غوطہ خوری کا لباس پہن کر ساحل گئے۔ پہلے عنبر سمندر میں کُودا اور اس کے پیچھے نسیم۔ دونوں مچھلیوں کی مانند مزے مزے سے تیرنے لگے۔ پانی کے نیچے۔۔۔۔۔ اور نیچے۔"

یکایک عنبر ایک جگہ ٹھہر گیا، اور نسیم جو اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اُس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ نسیم نے غصّے سے عنبر کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔

نسیم نے فوراً اُدھر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا!

یہ ایک بڑی سی کالی چیز تھی، جو سمندر کی تہہ میں چلی جارہی تھی۔ اُس کا رُخ سمندر کی گہرائی کی طرف تھا۔

کیا یہ کوئی شارک مچھلی تھی؟ اونہوں!۔۔۔۔ نسیم نے سوچا۔ شارک مچھلیاں تو یہاں ہوتی ہی نہیں۔ نہ وہیل ہی یہاں ہوتی ہیں۔

تو پھر یہ کیا ہے؟ نسیم کے دماغ میں رہ رہ کر سوال گُونج رہا تھا۔ یہی سوال عنبر کے دماغ میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔

وہ سیاہ سی شکل اب ذرا آگے جا چکی تھی اور آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

عنبر نے اپنا رُخ بدل لیا اور ساحل کی سمت جانے لگا۔ اس نے نسیم کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا آئے۔ غار کے پچھلے دہانے کے نزدیک، وہ ساحل پر آ گئے۔

"یہ کیا تھا؟" نسیم نے منہ پر سے خول ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"خود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا تھا؟" عنبر نے کہا۔

"ہمیں واپس جا کر پولیس کو بتانا چاہیے۔" نسیم بولا۔

"نہیں۔ اوّل تو ہمیں پتا نہیں کہ وہ چیز کیا تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی بڑا سا سمندری کچھوا ہی ہو۔ دوسرے یہ کہ اب تو وہ جو کچھ بھی تھا یہاں سے بہت دُور جا چکا ہو گا اور پولیس کے آنے تک اور بھی نہ جانے کتنی دُور جا چکا ہو گا۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ ہم اس کے بارے میں بھُول جائیں اور اپنا کام شروع کریں۔"

"تو آؤ!" نسیم نے کہا۔ "ہم غار کے اندر چلیں۔"

چند ہی لمحوں میں وہ دونوں تنگ راستے کے اندر گھٹنوں کے بل چل رہے تھے، جب وہ اندر گُپھا میں پہنچ گئے تو عنبر نے نعرہ لگایا "وہ مارا۔"

"کیا؟" نسیم نے کہا۔

”سُنو! غار چیخ رہا ہے؟“

”””آآآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔ اووووووووو۔۔۔۔۔ اووووووووو۔۔۔۔۔ اوووووہہہہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!“

”اب ہم کس راستے پر چلیں؟“ نسیم نے پوچھا۔ ”یہاں تو اتنے سارے راستے ہیں۔“

”ہم اُس راستے پر چلیں گے جس سے یہ آواز آ رہی ہے۔“

”اور آواز کا کیسے پتا چلے گا؟“ نسیم نے کہا۔ ”میرے کان تو اتنے تیز نہیں ہیں کہ۔۔۔۔“

”ہم یہ کام اپنے کانوں سے نہیں۔“ عنبر نے اپنی قمیص کی اندرونی جیب سے موم بتّیاں اور ماچس نکالتے ہوئے کہا ”بلکہ جلتی ہوئی موم بتّی سے لیں گے۔“ اُس نے پلاسٹک کے ایک ٹکڑے میں سے موم بتّیاں، اور ماچس نکالی اور ایک موم بتّی جلا کے نسیم کو دی، دوسری خود پکڑ لی اور پھر بولا:

"ہم ہر راستے کے سامنے موم بتّی لے جائیں گے۔ جس راستے کے سامنے موم بتّی کا شعلہ ہلنے لگے گا، وہیں سے آواز آرہی ہو گی۔"

""آآآآآآآآآآہہہہہ۔۔۔۔۔ اووووووووو۔۔۔۔۔اوووووہہہہ۔۔۔۔۔!"

غار کے کراہنے کی آواز پھر آئی۔

"یہی وہ راستہ ہے۔" نسیم نے بڑے جوش سے کہا۔

اس کی موم بتّی کا شعلہ ایک راستے کے سامنے تھر تھرایا تھا۔

"شِی!" عنبر نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "آہستہ بولو۔ ہو سکتا ہے غار میں کوئی آدمی ہو۔"

اُنہوں نے اب موم بتّیاں بجھا دیں، ٹارچ جلائی اور راستے پر چاک سے نشان لگا کر اندر داخل ہو گئے۔ اس راستے پر چلتے چلتے وہ ایک گپھا میں پہنچ گئے۔ اس گپھا میں اُنہوں نے پھر ہر راستے کے سامنے جلتی ہوئی موم بتّی رکھی۔ تین راستوں کے سامنے موم بتّی کی لَو ہلی۔

”میرا خیال ہے ہم اکیلے جانے کے بجائے اکٹھے ہی چلیں۔“ نسیم نے کہا ”میں اس کالی، چمک دار شے کو اکیلا دیکھنا نہیں چاہتا۔“

عنبر نے مُسکرا کر نسیم کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ پہلے راستے میں داخل ہو جائے۔ تھوڑی دُور جا کے عنبر کو محسوس ہوا کہ یہ راستہ تو واپس سمندر والی سمت میں جا رہا ہے کیوں کہ یہاں آ کر وہ مُڑ گیا تھا۔

”آؤ! اب دوسرے راستے کو دیکھیں۔“ عنبر نے کہا۔

”دوسرے راستے پر، ذرا آگے جا کے، انہیں محسوس ہوا کہ یہ راستہ بھی غَلَط نہ تھا کیوں کہ آگے جا کے اُنہیں غار کی چیخ اُونچی ہونے کے بجائے دھیمی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”اب ہمیں تیسرے راستے پر چلنا چاہیے۔“ عنبر نے کہا۔

”مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہم رات بھر اِسی طرح غار کے اندر چلتے رہیں گے۔“ نسیم بولا۔۔

”نہیں۔ تیسرے راستے پر ضرور کام یابی ہمارے قدم چومے گی۔“ عنبر بولا۔

اُس نے صحیح کہا تھا۔ وہ دونوں ذرا آگے گئے تھے کہ چیخنے کی آواز نزدیک سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

یہ راستہ آگے جا کے ایک اور سمت میں مُڑ گیا۔ پھر ذرا آگے جا کے اُس کے اندر سے ایک اور راستہ الگ ہو گیا۔

”یہ راستہ قدرتی معلُوم نہیں ہوتا۔“ عنبر نے ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یہ چھوٹا ہے اور انسان کا بنایا ہوا لگتا ہے۔“ اس نے موم بتّی پھر جلائی اور اس نئے راستے کے سامنے کی۔ شعلہ زور سے بھڑکا۔

”اس کا یہ مطلب ہوا کہ اصلی راستہ یہی ہے۔“ نسیم نے کہا۔

”ہاں۔ اس کا مطلب یہی ہے۔“ عنبر نے کہا ”مگر۔۔۔“

”عنبر! ایک منٹ ٹھہرو!“ نسیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ہلکی

ہلکی سی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"یہ تو کھودنے کی آواز ہے۔" عنبر نے غور سے سُن کر کہا۔ وہ دونوں اس راستے پر آگے بڑھے ہی تھے کہ نسیم نے آہستہ سے کہا۔ "عنبر!" اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ دبایا۔

عنبر نے چوکنّا ہو کر پیچھے دیکھا۔ اُن کے پیچھے، بالکل پیچھے، ایک آدمی کھڑا تھا۔ سیاہ لباس، ہاتھ میں پستول، چہرے پر نقاب!

بالکل شیر اڈا کو!

اور اُس نے پستول کا رُخ عنبر کی طرف کر رکھا تھا!

پُراسرار تالاب اور کالی شے

شیر اڈاکو اُنہیں مُڑتے دیکھ کر ایک طرف کو سِرک گیا اور پستول سے آگے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُس کے آگے آگے چلیں۔" عنبر نے نسیم سے کہا۔

شیرے ڈاکو نے ہاں میں سر ہلایا اور اُنہیں لے کر واپس گپھا کی طرف چل دیا۔ پستول کا منہ عنبر کی کمر کے پیچھے تھا، اس لیے عنبر اور نسیم فی الحال

صرف اس کا کہنا ہی مان سکتے تھے۔ لیکن عنبر کا ذہن کوئی ترکیب سوچنے میں مصروف تھا۔ وہ ذرا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

شیر ا اُنہیں ایک راستے سے دوسرے میں اور ایک گپھا سے دوسری گپھا میں لے گیا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ کوئی پانچ سات منٹ کے بعد اس نے ایک جگہ جا کر کہا۔ "ٹھہر جاؤ!" یہ پہلا لفظ یا حکم تھا جو تیسرے ڈاکو کے منہ سے ان پانچ سات منٹوں میں نکلا تھا۔

لڑکے رُک گئے۔ اس وقت وہ جس گپھا میں تھے، وہ دوسری گپھاؤں کی نسبت ذرا چھوٹی تھی اور اس میں دائیں طرف ایک راستہ جا رہا تھا۔

"اِدھر چلو!" مدھم سی آواز میں شیرے ڈاکو نے دُوسرا حکم دیا۔

عنبر اپنا ہونٹ مسل رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

وہ کوئی دس بارہ فٹ آگے چلے ہوں گے کہ یہ راستہ بند ہو گیا۔ آگے ایک چٹان کھڑی تھی۔ نسیم اور عنبر اس کی طرف دیکھ کر پیچھے مُڑے۔ مگر

شیرے ڈاکو نے پستول سے اشارہ کیا کہ وہیں کھڑے رہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا اور دائیں ہاتھ سے اس چٹان میں سے ایک پتھّر کھِسکایا۔ اب وہاں ایک سُوراخ سا کھُل گیا۔

"چلو! اندر چلو!"

اس سے پہلے کہ نسیم اور عنبر وہاں جاتے یا جانے سے انکار کرتے، شیرے نے پستول کی نالی لہرا کے اُنہیں پاؤں سے دھکّا دیا۔ وہ دونوں لُڑھک کر اندر جا گرے۔ یہ ایک تاریک سا کمرا تھا۔

شیرے نے اس پتھّر کو واپس چٹّان میں لگا دیا اور واپس چلا گیا۔

"ہم یہاں قید ہو گئے ہیں!" عنبر نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف ڈال کر کہا۔

نسیم نے کہا۔ "عاقِب کو ہماری مدد کے لیے یہاں آنا چاہیے۔"

"وہ یہاں کیوں آئے گا۔" عنبر نے اُداسی سے کہا۔ "وہ تو ان پُتلوں کے

ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہو گا۔"

عنبر کا خیال غلط تھا۔ عاقِب اس وقت پُتلوں کے ساتھ بیٹھا باتیں نہیں کر رہا تھا۔ جب نسیم اور عنبر چلے گئے تو عاقِب کے دماغ میں یہ بات آئی کہ غار کے اندر جبّار اور تبریزی بھی مِل سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے وہ انہیں نقصان پہنچائیں۔ عنبر اُن کا ایک ہیرا لے جا چکا تھا جس کے بارے میں کل تک اُن لوگوں کو پتا نہ تھا۔ لیکن جب اُنہیں آج پتا چلا ہو گا تو وہ سمجھ جائیں گے اور ممکن ہے سُراغ رساں نمبر ایک اور نمبر دو کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے تیسرے پُتلے میں ہوا بھری، اس کو اپنے کپڑے پہنائے، خود دوسرا لباس پہنا اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپتا چھپاتا، ڈیری فارم کی طرف چلا تا کہ وہاں جا کے چچا اسلم کو ساری بات بتائے اور ان سے مدد حاصل کرے۔

ابھی وہ کچّی سڑک سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ایک کار کی آواز آئی۔ کار کچی سڑک پر جا رہی تھی اور اس کی اگلی بتّیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس کی حیرت

کی انتہا نہ رہی جب وہ کار کچّی سڑک پر، اس سے کوئی پندرہ سولہ گز کے فاصلے پر رُک گئی۔

وہ بڑے غور سے اُدھر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد کار میں سے ایک شخص نکلا۔ اس نے سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا پہاڑی کے اوپر چڑھا اور چند ہی لمحوں میں عاقِب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

عاقِب تیز تیز چلتا ہوا ڈیری فارم کی طرف بڑھا۔ اب وہ سڑک پر آ گیا تھا۔ اچانک اس کے پیچھے سے ایک کار تیزی سے آئی اور گزر گئی۔ یہ وہی کار تھی جس پر کراچی کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

غار میں نہ جانے کیا گڑ بڑ ہے۔۔۔۔۔۔؟ عاقِب نے سوچا۔۔۔۔۔۔۔ کار ابھی ابھی تو اُدھر گئی تھی۔ اتنی جلد واپس کیوں آ گئی؟ اس نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ کسی آدمی سے ٹکرا کر ِگر پڑا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو اُس آدمی نے اُس کے ایک کندھے پر ہاتھ رکھ دیا کہ بھاگ نہ جائے۔

اُس آدمی کی ایک آنکھ پر کالا کپڑا لٹکا ہوا تھا اور دائیں گال پر گہرے زخم کا

نشان تھا!

ایک لمحے کو عاقِب سُن ہو کر رہ گیا!!

اُدھر، عین اسی وقت نسیم اور عنبر غار کے اندر بند پڑے تھے۔ جب اُنہوں نے ٹارچ جلا کر دیکھا تو آگے راستہ نظر آیا۔

"آؤ! اس راستے سے نکلیں۔" نسیم نے کہا۔

"چلو!" عنبر نے کہا۔

اور دونوں چل پڑے۔

"کیا یہ واقعی شیر اڈاکو تھا؟" نسیم نے پوچھا۔

"نہیں۔ شیر اڈاکو اگر زندہ ہو تو اس کی عمر ستّر سال کی ہو گی۔ وہ اتنی پھُرتی سے نہیں چل سکتا۔" عنبر نے کہا۔ "ظاہر ہے یہ کوئی اور ہی آدمی ہے جو شیرے ڈاکو کا بہروپ بھر کر غار کے اندر کسی خفیہ کام میں مصروف ہے۔"

”اگر ایسا ہے تو یہ شخص ہمیں کل رات یہاں کیوں نہیں ملا؟“

”اس لیے کہ کل ہمارے اندر آتے ہی غار کی چیخیں بند ہو گئی تھیں۔“عنبر نے کہا۔”اب مجھے یقین ہو تا جارہا ہے کہ ہم آج رات ہی یہ راز دریافت کر لیں گے۔“

”ہاں، کر ہی لینا چاہیے تاکہ کل رات پھر یہاں نہ آنا پڑے۔“نسیم نے کہا۔ "اے لو، یہ راستہ تو بند ہے!“

”گھبراؤ نہیں۔“عنبر نے تسلّی دی۔”نقلی شیر اہمیں مارنا چاہتا تو آسانی سے مار سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہو گا۔“

”ارے عنبر!“ یکایک نسیم چلّایا۔”وہ دیکھو!“ یہ کہہ کر اُس نے ٹارچ کی روشنی ایک طرف ڈالی۔

عنبر نے ٹارچ کی روشنی والی جگہ پر دیکھا۔ وہاں راستہ تو کوئی نہ تھا لیکن پتھّر

کی دیوار کے پاس لوہے کی ایک سلاخ رکھی ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی نہ کوئی راستہ موجود ہے اور اس سُلاخ کی مدد سے کوئی دروازہ وغیرہ کھلتا ہے۔" عنبر نے کہا۔ "ذرا ٹارچ کی روشنی اور نیچے کرو، میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی نہ کوئی ایسا پتھّر ضرور ہو گا جسے کھسکایا جا سکتا ہے۔"

جلد ہی اُنہیں ایک ایسا پتھّر مل گیا جسے لوہے کی سلاخ سے ہٹا کے وہ وہاں سے نکل آئے۔ یہ ایک راستہ تھا۔ وہ تھوڑی دُور ہی چلے تھے کہ اچانک زور سے چیخے، پھر پلٹ کر دو چار قدم بھاگے اور پھر ایک دوسرے کے اُوپر گِر پڑے۔

سامنے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے کالے کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا اور اس نے دائیں ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔ مگر نہیں، وہ آدمی نہ تھا۔ عنبر کو اچانک خیال آیا۔ وہ تو ڈھانچا تھا۔ ہڈّیوں کا ڈھانچا۔ اور ڈھانچا اُنہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ عنبر نے نسیم کو فرش

پر سے اُٹھایا اور اُسے لے کر ڈھانچے کے پاس پہنچا۔

"میرا خیال ہے، یہی اصلی شیر اڈا کو ہے۔"

"ہاں، تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔" نسیم نے کہا۔ "یہ بالکل اُس طرح بیٹھا ہوا ہے جیسے دُشمن کا مُقابلہ کرنے کے لیے تیّار ہو۔"

عنبر نے ڈھانچے کی انگلیوں سے پستول جُدا کرتے ہوئے کہا۔ "بے چارا شیر اڈا کو اُسی رات مر گیا ہو گا جس رات وہ یہاں آیا تھا۔" نسیم اور عنبر کو چند لمحوں کے لیے شیرے ڈاکو کے اس انجام پر بہت افسوس ہوا۔ عنبر نے پستول اپنی جیب میں ڈالا اور کہنے لگا۔ "آؤ، اب آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں آج رات ہی چیخوں کا سُراغ لگانا ہو گا۔ کیوں کہ نقلی شیر اڈا کو اس وقت اطمینان سے اپنے کام میں مصروف ہو گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اُسے یہ اطمینان ہو گا کہ ہم دونوں اس وقت بند ہیں۔ نہ

جانے کیوں میرا ذہن ایک بات کی طرف جا رہا ہے۔"

"کس بات کی طرف!"

"اس بات کی طرف کہ نقلی شیرا ہیروں کے چکّر سے تعلّق نہ رکھتا ہو۔"

"مگر یہ نقلی شیرا کون ہو سکتا ہے؟ تبریزی یا جبّار میں سے کوئی؟"

"نہیں۔ ان دونوں کو تو بہروپ بھرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور پھر وہ سر پھِرے آدمی ہیں۔ ہاں، میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ نقلی شیرا ایسا آدمی ہے جو ہمیں جانتا ہے۔ اور اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ڈیری فارم کے علاقے میں رہنے والا کوئی آدمی ہی نقلی شیرا بن سکتا ہے۔"

"وہ بہت احتیاط سے بول رہا تھا۔" نسیم نے کہا۔

"ہاں، اور یُوں لگتا تھا جیسے وہ الفاظ بڑی مُشکل سے ادا کر رہا ہے۔ اگر وہ کھُل کر بولتا تو شاید ہم اسے پہچان لیتے۔" عنبر نے کہا۔ "مگر ہمارے لیے ایک دقّت ہے۔ ہم ڈیری فارم پر موجود سب آدمیوں کو نہیں پہچانتے، نہ

ان کے نام ہی جانتے ہیں۔"

"یہ بات تو ہے۔" نسیم نے کہا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سر کھجانے لگا۔ "میرا خیال ہے، ہمیں نقلی شیرے اور ہیروں کے بارے میں اسلم صاحب کو بتا دینا چاہیے۔"

"اونہوں!" عنبر نے کہا۔ "یہ مسئلہ ہمیں خود ہی حل کرنا پڑے گا۔ آؤ، آگے چلیں اور آواز کی طرف بڑھیں۔"

وہ اور آگے بڑھے۔ یہ راستہ بغیر مُڑے آگے اور آگے چلتا رہا اور پھر وہ ایک گپھا میں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے اِدھر اُدھر روشنی ڈال کر دیکھا۔

اس گپھا کے بیچوں بیچ ایک تالاب تھا اور اس میں سے ایک کالی چکنی شے باہر آ رہی تھی۔

نسیم اور عنبر سہم کر دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔

بھاگو!

"تم یہاں کیا کر رہے ہو، لڑکو!" کالی کالی چِکنی شَے نے تالاب سے باہر آ کر نسیم اور عنبر سے سوال کیا۔ تب دونوں سُراغ رسانوں نے دیکھا کہ وہ کالی چکنی شَے در اصل سیاہ چمک دار غوطہ خوری کا لباس تھا جو ایک آدمی پہنے ہوئے تھا۔ دونوں آنکھیں جھپکائے بغیر اُس آدمی کو دیکھ رہے تھے۔

پھر اچانک عنبر نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "جناب کیا یہی سوال ہم آپ سے پوچھ سکتے ہیں؟ ہم دونوں تو ڈیری فارم کے مالک مسٹر اسلم کی

اجازت سے یہاں آئے ہیں، لیکن آپ کسی خفیہ سمندری راستے سے آئے ہیں۔"

"ہاں، لیکن میں تم سے یہاں آنے کا اجازت نامہ نہیں مانگ رہا تھا۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "میں تو یہ پُوچھ رہا تھا کہ تم یہاں۔۔۔۔ اس غار میں۔۔۔؟"

"جناب، ہم اصل میں اس غار کے چیخنے کی وجہ کرنے آئے تھے۔ کیوں کہ اِس پُراسرار چیخ سے اسلم صاحب کے ملازم ڈر کر ڈیری فارم چھوڑ کر بھاگ۔۔۔۔۔"

"ٹھہرو! میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ پوری تفصیل سُنوں۔ لیکن چوں کہ تم لوگوں نے مجھے دیکھ لیا ہے، اس لیے مجھے اپنے ہیڈ کوارٹر سے کچھ پوچھنا پڑے گا۔"

"جناب، گستاخی معاف، میرا خیال ہے آپ بحری فوج سے تعلّق رکھتے ہیں۔" عنبر نے کہا۔

”ہاں، اور ایک خفیہ مشن پر یہاں آئے ہیں۔“ اُس آدمی نے کہا۔ ”تم نے یہاں آس پاس کوئی عجیب سی چیز تو نہیں دیکھی؟“

”نہیں جناب۔ صرف نقلی شیر ڈاکو۔۔۔۔۔۔“

”نہیں۔ میں چیز کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ!“ یکایک نسیم بولا۔ ”ج۔۔۔۔۔۔جی جناب سمندر میں ایک کالی سی، بڑی سی، چیز ساحل سے دُور کھُلے سمندر کی طرف جا رہی تھی۔“

”ہاں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں یہی پوچھنا چاہتا تھا۔۔۔۔“

”وہ۔۔۔ اوہو! تو کیا وہ کوئی نئی آب دوز تھی؟“ نسیم ایک دم چلّایا۔

”ہاں، لیکن تم اِس کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے۔۔۔۔۔ یہ ایک قومی راز ہے۔“ اُس آدمی نے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو، میں ہیڈ کوارٹر سے پوچھتا ہوں۔“

”ج۔۔۔جناب۔“ عنبر نے کہا۔ ”ایک عرض ہے۔“

"کہو۔"

"ہم آپ ہی کی طرح مُلک کے شہری ہیں۔ اگر یہ سب کچھ خفیہ ہے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اِس کا ذکر نہیں کریں گے۔"

"ہوں۔ میں تمہارے اُوپر بھروسا کرتا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "پھر بھی مجھے اپنے ہیڈ کوارٹر سے۔۔۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ دس بارہ قدم کے فاصلے پر گیا اور لباس میں سے ایک وائرلیس سیٹ نکال کر کچھ کہنے لگا۔

عنبر اور نسیم کے لیے انتظار کے یہ چند لمحے بہت کڑے تھے۔ جب اُس شخص نے واپس آ کر انہیں بتایا کہ ہیڈ کوارٹر والوں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ، جناب۔" عنبر نے کہا۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں دو تین باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اُن کا تعلّق آپ کے کام سے بالکل

نہیں۔"

"ہُوں۔۔۔۔۔پوچھو۔"

"کیا کل رات بھی آپ اس غار میں پھِر رہے تھے؟"

"ہاں، اور تم میں سے کوئی مجھے دیکھ چکا تھا، لیکن میں جلدی سے چھُپ گیا تھا۔"

"کیا آپ نے غار کے راستوں میں کوئی راستہ بند کیا یا کھولا ہے، جس سے آواز پیدا ہونے لگی ہے؟"

"نہیں۔ یہ آوازیں اُس وقت بھی آرہی تھیں جب ہم لوگ یہاں پہلی بار آئے تھے۔"

"کیا آپ کا کام اتنا خفیہ ہے کہ آپ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنا پسند کرتے ہیں؟"

"پسند نہیں، ضروری خیال کرتے ہیں۔ مجھے سوائے تمہارے اور کسی نے

نہیں دیکھا اور نہ کوئی دیکھ سکے گا۔"

"بہت مہربانی، جناب۔" عنبر نے کہا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔ یہ سوال میں نے غار کی چیخنے کی آواز کا معمّہ حل کرنے کے سِلسلے میں پوچھے تھے۔"

"میں سمجھ گیا۔ اچھّا، اب میں چلتا ہوں۔۔۔۔۔ تم اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کروگے۔ نہ میرے بارے میں اور نہ اُس شکل کے بارے میں جو سمندر میں تم لوگوں نے دیکھی ہے۔"

"جج۔۔۔۔ جناب۔" عنبر نے کہا۔ "ایک محبِّ وطن شہری ہونے کی حیثیت سے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"بولو۔"

"آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے؟ آپ شاید میرا مطلب۔۔۔۔۔"

"اوہ!" وہ آدمی مُسکرایا۔ "تم واقعی محبِّ وطن ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔۔۔۔۔۔ یہ رہا میرا کارڈ۔"

کارڈ دکھانے کے بعد اُس نے تالاب میں چھلانگ لگا دی اور نظروں سے غائب ہو گیا۔

"تم نے کارڈ کیوں دیکھا؟ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو؟" نسیم نے پوچھا۔

"مجھے اچانک خیال آیا کہ ہمارا دُشمن بھی تو کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔ اور وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے جھٹ سے اپنا کارڈ دکھا دیا۔"

"اب ہمیں پھر۔۔۔"

"ہاں، اب ہمیں پھر اس آواز کی طرف جانا ہو گا اور یہ کوشش کرنا ہو گی کہ ہمیں کھودنے کی آواز سنائی دے۔ میرا دل کہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہمیں کھودنے کی آواز ضرور آئے گی۔" عنبر نے کہا۔ "جو دُشمن یہ سارا چکّر چلا رہا ہے، وہ غار میں موجود ہے کیوں کہ ابھی تک غار کے چیخنے کی آواز آرہی ہے۔"

نسیم نے کان لگائے۔ غار کے چیخنے کی آواز واقعی آرہی تھی۔ وہ چوں کہ

دُوسری باتوں میں مصروف ہو گئے تھے اس لیے اُن کا دھیان اُس طرف سے ہٹ گیا تھا۔

"تو آؤ، چلیں۔" نسیم نے کہا۔

"چلو، میں موم بتّی جلا کر دیکھتا ہوں کہ آواز کس رستے سے آ رہی ہے۔"

اتّفاق کی بات کہ پہلے ہی راستے پر موم بتّی کا شعلہ زور سے بھڑکا اور آواز بھی نزدیک ہی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دونوں سُراغ رساں جھَٹ اُس راستے پر چل پڑے۔

تھوڑی دُور چل کر یہ راستہ پر ایک گپھا میں ختم ہو گیا۔ مگر یہ گپھا چھوٹی سی تھی اور اس میں سے راستے بھی تین چار ہی نکل رہے تھے۔

"اب ہمیں پھِر موم بتّی جلا کر دیکھنا پڑے گا۔" عنبر نے کہا۔

"نہیں۔ میں ہر راستے پر کان لگا کر سُنتا ہوں۔ اس یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس راستے سے چیخنے کی آواز آ رہی ہے۔"

"آآآآآہ ہ ہ ہ۔۔۔۔۔ اووو و۔۔۔۔۔۔ اوووودہ ہ ہ!" ایک راستے سے کافی زور سے آواز آئی۔

"آجاؤ۔" نسیم نے کہا۔

"چلو۔" عنبر بولا اور دونوں سُراغ رساں اس راستے پر چلنے لگے۔ ذرا آگے جاکے اُنہیں زمین کھودنے کی ہلکی ہلکی آواز آئی۔

"ہوں! یہ تو زمین کھودنے کی آواز آرہی ہے۔" نسیم نے کہا۔

"اب ہمیں ٹارچیں بجھا دینی چاہئیں۔" عنبر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی دیکھ لے۔"

وہ دونوں ٹارچیں بجھا کر آوازوں کی طرف کان لگائے، آگے بڑھنے لگے۔ اب جس راستے پر وہ چل رہے تھے، وہ قدرتی نہیں تھا بلکہ انسانوں کا کھودا ہوا تھا کیوں کہ ہو بالکل ہموار اور سیدھا تھا۔

ذرا آگے جاکے انہیں روشنی کی ایک ہلکی سی کِرن نظر آئی۔ وہ راستے کے

آخری سِرے سے آ رہی تھی۔ عنبر اور نسیم ہوشیار ہو گئے اور آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ جُوں جُوں وہ آگے بڑھ رہے تھے، روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور چیخنے کی آواز بھی اُونچی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کھودنے کی آوازیں بھی زور زور سے آنے لگی تھیں۔

جو کچھ بھی اندر ہو رہا تھا، آج وہ دیکھ لیں گے۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس سُوراخ تک پہنچ گئے جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔

ان دونوں نے سُوراخ میں سے اندر جھانکا۔ بوڑھا جبّار ایک کُدال سے زمین کھود رہا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی سی گیس کی لالٹین رکھی تھی۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کوئی چھوٹا سا پتھّر نکالتا، اسے غور سے دیکھتا، قہقہہ لگاتا اور قریب رکھے ہوئے ایک کپڑے کے تھیلے میں ڈال دیتا۔

"تمہارا خیال صحیح تھا۔" نسیم نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں، لگتا تو یہی ہے کہ جبّار کو ہیروں کی کان مل گئی ہے۔ دیکھو، کتنا خوش ہے۔" عنبر نے آہستہ سے کہا۔

اگر یہ لوگ زور زور سے بھی باتیں کرتے تو شاید جبّار نہ سُن سکتا کیوں کہ ایک تو وہاں غار کے چیخنے کی آواز بہت اونچی تھی، دوسرے کھُدائی کے باعث کافی شور پیدا ہو رہا تھا۔ تیسرے جبّار اپنے کام میں اِتنا مگن تھا کہ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

"تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ جبّار صرف رات کو کھدائی کرتا ہے تا کہ کسی کو اس بارے میں پتا نہ چل سکے۔" نسیم نے کہا۔

"مگر ہمیں ابھی دو تین سوالوں کے جواب اور ڈھونڈنے ہیں۔" عنبر بولا۔ "ایک تو یہ سوال کہ غار کیوں چیختا ہے؟ دوسرا یہ کہ وہ کسی کے اندر آتے ہی چیخنا بند کیوں کر دیتا ہے؟ اور تیسرے یہ کہ نقلی شیر اڈا کو اور وہ زخم کے نشان والا لمبا آدمی کون ہے اور ہیروں کی کان میں ان کا کیا حصّہ ہے؟"

ابھی وہ دونوں یہ باتیں کر رہے تھے کہ گھنٹی بجنے کی ہلکی سی آواز آئی۔

آواز جبّار کے قریب سے ہی آ رہی تھی۔ جبّار نے جھٹ سے کُدال نیچے رکھ دی اور گیس لیمپ سے ذرا فاصلے پر پڑی ہوئی گھنٹی کی آواز بند کر دی۔ اس کے بعد وہ اُس سوراخ کی طرف بڑھا جہاں سے عنبر اور نسیم اُسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"بھاگو!" عنبر نے کہا اور دونوں سُراغ رساں تیز تیز چلتے، پیچھے آ کے، ایک جگہ چھُپ گئے۔

غار اب بھی چیخ رہا تھا "آآآآآآآآآ ہہہ۔۔۔۔۔۔۔۔ اووووو۔۔۔۔۔ اووووووہہہ!"

بوڑھا جبّار اُسی سُوراخ میں سے باہر آیا اور قریب پڑا ہوا ایک پتھّر اُٹھا کر سوراخ میں رکھنے لگا۔ اسی لمحے غار زور سے چیخا۔ "آآآآآآآآآآ ہہہ۔۔۔۔ اووووو۔۔۔۔۔"

عنبر اور نسیم بوڑھے کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے پتھّر واپس سُوراخ میں رکھ کر اُسے بند کر دیا تو چیخ بھی بند ہو گئی۔ اب سوراخ کی

جگہ دیوار نظر آ رہی تھی۔

"یہ وجہ تھی۔" نسیم نے کھُسر پھُسر کی۔ "توبہ ہے۔ تبھی تو کسی کو پتا نہیں چلتا تھا۔ یہ گھنٹی کی آواز اس بات کی اطلاع تھی کہ کوئی غار کے اندر آ رہا ہے۔"

"ہاں، ہمارا یہ خیال میں تھا کہ پہاڑی کے اوپر کوئی پہرا دیتا رہتا ہے اور جب بھی کوئی آدمی غار میں داخل ہوتا ہے، غار چیخنا بند کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے اوپر والا آدمی اِس گھنٹی کے ذریعے جبّار کو خبردار کر دیا تھا اور آنے والے کو یہاں کوئی بھی سُراغ نہ ملتا تھا۔" عنبر نے کہا۔ "میرا خیال ہے کوئی اندر آ رہا ہے۔ خاموش ہو جاؤ۔"

چند لمحوں بعد قدموں کی چاپ بُلند ہوتی گئی اور پھر ایک شخص ٹارچ ہاتھ میں لیے آیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو میلے میں جبّار کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ عنبر نے سوچا یہ تبریزی ہی ہو گا۔

"تبریزی۔" جبّار نے آگے بڑھتے ہوئے اس شخص سے کہا۔ "کیا ہوا؟"

”دو آدمی غار کے اندر آ رہے ہیں۔“ تبریزی نے کہا۔ ”چلو، بھاگ چلیں۔“

جبّار اور تبریزی سُراغ رسانوں سے صرف پانچ سات فٹ کے فاصلے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے، اس لیے وہ اُن کی باتیں آسانی سے سُن سکتے تھے۔

”تمھیں یقین ہے کہ وہ اندر ہی آ رہے ہیں؟“ جبّار نے پوچھا۔

”میں نے خود انہیں اندر آتے ہوئے دیکھا ہے۔“ تبریزی نے کہا۔ ”دو ایک دِنوں سے تو یہاں بہت سے لوگ منڈلانے لگے ہیں۔“

”ہمارا کام دو ایک روز کا اور رہ گیا ہے، اس لیے ہمیں احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھِر جائے۔“

وہ دونوں ایک طرف جا کے مُڑ گئے اور پھر اُن کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ وہ اُدھر ہی گئے تھے جدھر سے تبریزی آیا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ غار میں آنے کا کوئی اور راستہ ضرور ہے جسے یہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ مگر دُوسرے اِس سے واقف نہیں۔" عنبر نے کہا۔

"اب کیا کریں؟" نسیم نے کہا۔ "اندر چلیں جہاں جبّار اب کھدائی کر رہا تھا؟"

"نہیں۔ ہمیں باہر جا کر مدد لانا ہو گی۔" عنبر نے کہا۔ "پتا نہیں کہ یہ آدمی ہمارے دوست ہیں یا دُشمن، اس لیے ہمارا اندر جانا ٹھیک نہیں۔"

جوں ہی دونوں سُراغ رساں باہر جانے کے ارادے سے اُس راستے پر آئے جو اُنہیں باہر لے جاتا، دو آدمی اندھیرے میں سے اچانک نکلے۔ ان میں سے ایک نے نیم کا بازو پکڑ لیا اور دوسرے نے عنبر کا!

عنبر نے اُس شخص پر، جس نے اُسے پکڑ رکھا تھا، ٹارچ کی روشنی ڈالی تو اُس کی جان نکل گئی۔ اُس کی دائیں آنکھ پر کالا کپڑا بندھا ہوا تھا اور بائیں آنکھ پر زخم کا نشان تھا!

ہیروں کی داستان

"آخر پکڑے گئے۔" اُن میں سے ایک آدمی نے کہا اور عنبر نے جھٹ اُس کی آواز پہچان لی۔

"عاقِب! تم؟"

"ہاں۔ اب ذرا غور سے سُنو۔ میں فرّاٹے بھرتا ہوں، کیوں کہ وقت بہت کم ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ کراچی کی نمبر پلیٹ والی کار میں سے ایک آدمی، جس نے کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اُتر کر غار میں چلا گیا تو میں

ڈیری فارم کی طرف چلا۔ جب وہ کار دوبارہ واپس گئی تو میں بوکھلا کر تیز تیز چلا اور میری ٹکّر رؤف صاحب سے ہو گئی۔" اُس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا نام عبد الرّؤف ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ "یہ رہا میرا شناختی کارڈ۔ میں ایک بیمہ کمپنی کا انسپکٹر ہوں۔ جب تمہارے دوست نے مجھے بتایا کہ تم لوگ غار کے اندر ہو اور تمہاری زندگی خطرے میں ہے تو اس کے ساتھ آ گیا۔"

"یوں بھی اگر ہم ڈیری فارم جاتے تو دیر ہو سکتی تھی۔" عاقِب نے کہا۔

"جس آدمی کے پیچھے پیچھے میں یہاں آیا ہوں، وہ بہت خطرناک مجرم ہے۔" رؤف نے کہا۔ "میں نے اور عاقِب نے یہ کوشش کی کہ چُپکے سے اِس غار میں داخل ہو جائیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم دیکھ لیے گئے ہیں۔"

"جی ہاں۔" عنبر نے کہا۔ "آپ کے آنے کی اِطّلاع یہاں پہنچ چکی تھی۔"

”اِطّلاع؟“

”ہاں۔“ عنبر نے کہا اور وہ ساری باتیں کہہ سنائیں جو اُس نے اور نسیم نے دیکھی تھیں۔

”مجھے پہلے ہی شُبہ تھا کہ وہ لوگ ہمیں دیکھ چکے ہیں۔ پھر بھی ہمیں اُن کا پیچھا کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی زیادہ دور نہ گئے ہوں۔ اور جو تھیلا تم دیکھا تھا، اس میں وہ ہیرے ہیں جن کے پیچھے میں لگا ہوا ہوں۔“

”پیچھے؟“

”ہاں۔ یہ ہیرے دراصل مختلف ملکوں سے حاصل کیے گئے تھے اور بغیر ترشے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کراچی میں اُن کی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں سے اُنہیں پُراسرار طریقے سے چُرا لیا گیا۔ اِن ہیروں کا بیمہ میری کمپنی نے کیا تھا، اس لیے میں کمپنی کی طرف سے سُراغ لگا رہا ہوں۔“

”تو شیرے ڈاکو کے غار میں ہیروں کی کان نہیں ہے۔“

”نہیں۔“

”کیا آپ اس چور کو جانتے ہیں؟“

”نہیں۔ میرا مطلب ہے شکل سے نہیں جانتا۔ لیکن اُس کا نام جانتا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑا مُجرم ہے اور صرف کبھی کبھی بہت بڑی چوری کرتا ہے۔ اس کا نام پرویز ہے۔“

”جب وہ پکڑا ہی نہیں گیا تو آپ کو بتا کیسے چلا کہ یہ چوری پرویز ہی نے کی ہے؟“عنبر نے پوچھا۔

”چوری کرنے کے طریقے سے۔“ رؤف نے بتایا۔ ”ہر چور کا اپنا طریقۂ واردات ہوتا ہے، اور بہت سے چور اس طریقے سے پہچان لیے جاتے ہیں۔“ رؤف ایک لمحے کو رُکا۔ ”جس طریقے سے ہیرے چرائے گئے وہ سوائے پرویز کے اور کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔“

”آخر پرویز پکڑا کیوں نہیں گیا؟“عنبر نے سوال کیا۔

”اس لیے کہ وہ بھیس بدلنے کا ماہر ہے۔“ رؤف نے کہا۔

”آپ کب سے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟“عنبر نے کہا۔”اور آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہ سیاہ وادی میں رہتا ہے؟“

”کچھ مہینے پہلے چوری شدہ ہیروں میں سے ایک ہیرا فیصل آباد میں بیچا گیا تھا اور میں تب سے پرویز کے پیچھے لگا ہوں۔ وہیں مجھے پتا چلا کہ وہ سیاہ وادی میں چلا گیا ہے۔ اب مجھے یہ علم نہیں کہ وہ کس بھیس میں ہے۔ یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”وہ آپ کو جانتا ہے؟“

”میرا خیال ہے، جانتا ہے۔ اِسی لیے میں نے ایک آنکھ پر کپڑا باندھ رکھا ہے اور ایک گال پر زخم کا نشان چپکا لیا ہے۔“

”کلک!“ جیسے فوٹو اُترنے کی آواز آتی ہے۔ عنبر کے ذہن میں کچھ باتیں

ایک دُوسرے کے ساتھ جُڑ گئیں۔

پرویز ہیرے چُرا کر اِس غار میں چھپا گیا تھا۔ جبّار اور تبریزی یہاں سونے یا ہیرے جواہرات تلاش کرتے رہتے تھے۔ اُنہیں کسی پُراسرار طریقے سے اِن ہیروں کا سراغ مل گیا اور وہ کھود کھود کر انہیں نکالنے لگے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" عنبر نے کہا۔ "پرویز نے ہیرے ایک ہی جگہ چھپائے ہوں گے۔ وہ الگ کیسے ہو گئے کہ اُنہیں کھود کر نکالنے کی ضرورت پڑی؟"

"اس کا جواب بہت آسان ہے۔" رؤف نے کہا۔ "اس علاقے میں بحری فوج کی مشقیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی توپوں کی دہل سے بعض اوقات پہاڑوں کے پتھّر گِر جاتے ہیں اور چٹانیں اِدھر اُدھر ہو جاتی ہیں۔"

"بس بس۔ میں سمجھ گیا۔ اب آپ میرے ساتھ آئیں۔ جبّار اور تبریزی دونوں میرے سامنے اُس راستے پر گئے تھے۔ وہ باہر پہنچ گئے ہوں گے۔ ہمیں بھی اُسی راستے پر باہر جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے اِس نئے راستے سے

اُن کا مکان نزدیک پڑے گا۔"

وہ چاروں اس راستے پر ہو گئے۔ لیکن ذرا آگے جا کے یہ راستہ بند ہو گیا۔

"وہ یہیں کہیں سے باہر گئے ہوں گے۔"

عنبر نے دیکھا کہ جس جگہ راستہ بند ہے وہاں ایک پتھّر کا رنگ دوسرے پتھّروں سے مختلف ہے۔ "میرا خیال ہے ہمیں یہ پتھّر ہلانا چاہیے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

رؤف نے وہ پتھّر ہٹایا تو ایک تنگ سا راستہ نمودار ہوا۔ اُس نے پستول ہاتھ میں لیا اور اُس کے اندر داخل ہو گیا۔ پھر کوئی خطرہ نہ دیکھ کر اُس نے پستول جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل گیا۔ عنبر، نسیم اور عاقِب بھی ایک ایک کر کے اُس راستے سے باہر نکل گئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ پہاڑ کے عین اوپر جھاڑیوں کے ایک جھُنڈ کے پاس کھڑے ہیں۔ اُن سے ذرا فاصلے پر جبّار اور تبریزی کا مکان نظر آ رہا تھا۔

وہ تیز تیز چلتے وہاں پہنچے اور دروازہ کھولا۔ جبّار اور تبریزی چائے پی رہے تھے اور اُن کے سامنے، میز پر، چمڑے کا ایک خالی تھیلا اور کیتلی کے پاس بہت سے ہیرے پڑے تھے۔

پھنسنے اور پھنسے!

تبریزی کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ وہ اُن کو اندر آتے دیکھ کر حیران رہ گیا اور جلدی سے ہیرے سمیٹنے کے لیے آگے بڑھا۔

رؤف نے پستول تان کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ!"

"میرا خیال ہے، رؤف صاحب۔" عنبر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کسی کو اسلم چچا کے پاس بھیج کر اُنہیں سارے حالات کی اطلاع دے دینی چاہیے۔"

”ہاں، اور جو بھی جائے، وہ اُن سے کہے کہ پولیس کو لے کر فوراً یہاں پہنچیں تاکہ مجرم ثبوت کے ساتھ پکڑ لیے جائیں۔“

عنبر نے نسیم سے کہا کہ وہ دوڑا دوڑا جائے اور اسلم صاحب کو اطلاع دے۔ نسیم کافی پھرُتیلا تھا وہ جھٹ پٹ روانہ ہو گیا۔

”میرا خیال ہے، یہ لوگ اتنے مجرم نہیں جتنے آپ کے پرویز صاحب۔“ عنبر نے رؤف سے کہا۔

”مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اِن میں سے کوئی پرویز نہیں ہے؟“

”یہ تو آسان سی بات ہے، رؤف صاحب۔ میں اسلم چچا سے اِن دونوں کے بارے میں پوچھ چکا ہوں۔ یہ یہاں پر برسوں سے رہ رہے ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی پرویز نہیں ہو سکتا۔ وادی کا بچّہ بچّہ اِنہیں جانتا ہے۔“

”ہمیں معاف کر دیں، جناب۔“ جبّار گڑگڑا کر بولا۔ ”ہم نے کوئی چوری نہیں کی۔ ہمیں تو کھُدائی کرتے سالوں بیت گئے اور اب خدا کی مہربانی سے

ہمیں یہ ہیرے مل گئے ہیں۔“

”مگر تم جانتے ہو کہ یہاں کوئی کان نہیں۔“عنبر نے کہا۔

”ہمارے خیال میں تو یہاں ہیروں کی کان ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ عنبر نے آگے بڑھ کر کرخت لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ یہ ہیرے چوری کے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور ایک پلنگ کے نیچے پڑے ہوئے کچھ اخبار اور رسالے اور دو کتابیں نکال کر رؤف کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھیے!“ رؤف نے غور سے دیکھا۔ یہ پرانے اخبار اور رسالے تھے جن میں کراچی کے عجائب گھر سے چوری کیے ہوئے ہیروں کے بارے میں خبریں چھپی تھیں۔

روف کے ذرا سے دھمکانے پر تبریزی نے سب کچھ اُگل دیا۔ ”جب ہمیں پہلا ہیرا ملا جناب، تو ہم سمجھے کہ یہاں پر ہیروں کی کان ہے۔ اس کے بعد

ایک ہم دو ایک کتابیں اس علاقے کے جغرافیے کے بارے میں لائے۔ اُن کے مطابق یہاں کسی بھی کان کے پائے جانے کا امکان نہ تھا کیوں کہ یہ علاقہ سارا کا سارا دیکھا جا چکا تھا۔ ہم بہت حیران ہوئے۔ حکومت کی اطلاع تو غَلَط نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر یہ ہیرا کہاں سے آیا؟ تب ایک دِن ہم نے اخبار میں ہیروں کی چوری کے بارے میں یہ رپورٹ پڑھی۔ تب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ہیرے چوری کے ہیں۔"

"اور تب ہم نے سوچا کہ اگر یہ ہیرے چوری کے ہیں۔" جبّار بولا۔ "اور ہم اُنہیں اُڑا لیں تو کوئی ہم پر شک نہیں کرے گا۔"

"تم لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ چوری کا مال حاصل کرنا، چھپانا یا خریدنا جرم ہے؟" جبّار اور تبریزی نے اِس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ یہ جانتے تھے۔

"حیرت یہ ہے کہ چور کو ان لوگوں کی سرگرمیوں کا کچھ علم نہ ہو سکا!" رؤف نے کہا۔

"جناب، میرا خیال ہے چور نے اِن پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ یہیں ڈیری فارم کے علاقے میں رہتا ہے اور ان کی نگرانی کرتا ہے۔" عنبر بولا۔

"میرا خیال ہے کہ سارے ہیرے ہم نکال چکے ہیں۔" جبّار بولا۔ "شاید دو چار اور ہوں۔"

"بس تو پھر چور بھی تمہاری تاک میں ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں آج ہی آنے کی کوشش کرے۔" عنبر بولا۔ "رؤف صاحب، ہمیں اُسے پکڑنے کے لیے ہوشیار ہو جانا چاہیے۔"

اچانک ایک پُراسرار گھُٹی گھُٹی آواز عنبر کے پیچھے سے آئی۔ "تم بہت چالاک لڑکے ہو۔ میں آ گیا ہوں لیکن خبردار! کسی نے کوئی حرکت کی تو میں اِس لڑکے کو گولی سے اڑا دوں گا!"

رؤف چیخا۔ "عنبر بالکل نہ ہلنا! اگر یہ شخص پرویز ہی ہے تو یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

”میرا تعارف کرانے کا شکریہ، مسٹر رؤف۔ آپ بھی مہربانی کر کے اپنا پستول زمین پر پھینک دیجیے۔“

رؤف نے پستول چُپ چاپ زمین پر پھینک دیا۔ ”خبردار! کوئی ہلنے جُلنے کی کوشش نہ کرے۔“ گھُٹی گھُٹی آواز والے آدمی نے کہا۔ ”اب تم سب سامنے والی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

جبّار، تبریزی، رؤف، عنبر اور عاقِب پانچوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

”عنبر! تم اِدھر آؤ۔“ اُس نے حکم دیا۔ ”اُس کونے میں جو پلنگ پڑا ہے، اس کی پائنتی کھولو۔ جلدی۔“

عنبر نے پائنتی کھول دی تو اس نے حکم دیا۔ ”اس سے سب کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ یہ لو چاقو سے رسّی کے ٹکڑے کر لو۔“ اُس نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکال کر زمین پر پھینکا۔

”مان لو، عنبر۔“ رؤف نے کہا۔ ”کوئی چالاکی نہ کرنا۔ پرویز بہت خطرناک

آدمی ہے۔"

عنبر نے جبّار، تبریزی، رؤف اور عاقِب چاروں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ پرویز نے ایک ہاتھ سے پستول پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے عنبر کو باندھا اور پھر پستول جیب میں رکھ کر سب لوگوں کی گرہیں کس دیں۔ اب وہ مُسکراتا ہوا آگے بڑھا اور ہیرے چمڑے کے تھیلے میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ سال بھر بھی اگر میں کوشش کرتا، تو بھی پتھّروں کے کھسکنے کی وجہ سے سارے ہیرے جمع نہ کر سکتا۔ تم لوگوں نے بہت کام کیا ہے میرے لیے۔۔۔۔۔۔ اچھا، خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ چلتا بنا۔ اُس نے شیرے ڈاکو کا بہروپ بھر رکھا تھا۔

جب وہ کمرے سے نکل گیا تو رؤف بولا۔ "اب ہمیں مدد کے لیے چلّانا چاہیے ورنہ وہ بہت دُور نکل جائے گا۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ مدد کے لیے چلِّاتے، باہر سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھُلا اور نسیم، اسلم صاحب اور ایک موٹا تازہ آدمی

اندر آیا۔ یہ تھانے دار تھا۔

”یہ تم سب بندھے کیوں پڑے ہو؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

پردہ اُٹھتا ہے

اِن لوگوں نے آتے ہی سب کی رسّیاں کھول دیں۔

”میرا خیال ہے ہمیں چور کا پیچھا کرنا چاہیے۔“ رؤف نے کہا۔ ”ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گیا ہو گا۔“

عنبر نے ہاتھ پاؤں کھُلتے ہی اپنا دایاں ہونٹ مسلنا شروع کر دیا تھا، جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔ ”پرویز کو ہم اس طرح نہیں پکڑ سکتے۔“

”تب؟“

”ہمیں اطمینان سے کام کرنا ہو گا۔“

”کہاں؟“

”ڈیری فارم پر۔“

”کیا مطلب؟“ اسلم صاحب نے حیرت سے کہا۔ ”کیا پرویز ڈیری فارم میں رہتا ہے؟“

”ابھی ابھی جو بات مجھے سُوجھی ہے، اگر وہ درست ہے تو پرویز کافی عرصے سے ڈیری فارم میں رہتا ہے۔“ عنبر نے اسلم صاحب کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”باقی لوگ کدھر ہیں؟“

”باقی لوگ کون؟ ڈیری فارم کے لوگ؟ وہ تو آدھی رات سے تُم لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ حفیظ، رفیق، پروفیسر دُرّانی، سب تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”وہ سب لوگ کہاں جمع ہوں گے؟“

”ڈیری فارم پر۔“

”بس، تو پھر آپ لوگ ڈیری فارم پر چلیے۔ جلدی سے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کا مجرم وہاں پہنچ کر آپ کے حوالے کر دوں گا۔“ عنبر نے پورے یقین سے کہا۔

”بہتر ہو گا کہ تم ساری بات یہیں مجھے بتا دو۔“ تھانیدار نے کہا۔

رؤف آگے بڑھ کر بولا۔ ”جناب، دیر نہ کیجیے۔ یہ لڑکے بہت زیادہ ذہین سُراغ رساں ہیں۔ میں پچھلے بیس منٹ سے اِن کے ساتھ ہوں اور اِن کا لوہا مان گیا ہوں۔ آپ جلدی کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ مُجرم نکل جائے۔“

”چلیے۔“ تھانیدار نے کہا۔

جب یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ڈیری فارم پہنچے تو وہاں ابھی لوگ واپس آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔

”میرا خیال ہے پرویز مکان سے نکل کر ہیرے چھپائے گا، پھر اپنا بھیس بدلے گا، اور تب یہاں پہنچے گا۔“عنبر نے کہا۔

”یہ کس کی باتیں ہو رہی ہیں؟“ پروفیسر دُرّانی نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ لنگڑا رہے تھے۔

”آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔“عنبر نے کہا۔ ”یہ آپ لنگڑا کیوں رہتے ہیں؟“

”کچھ نہیں، بیٹے۔“ پروفیسر نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اور لوگوں کی طرح آدھی رات سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ اِسی دوران میں ایک جگہ گِر کر زخمی ہو گیا۔“

”تھانیدار صاحب۔“ عنبر زور سے بولا۔ ”آپ پرویز کو پکڑنے میں دیر کیوں کر رہے ہیں؟“

”مگر پرویز ہے کہاں؟“ تھانے دار جھنجھلایا۔

”یہ، آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ پروفیسر دُرّانی کے روپ میں۔“

پروفیسر یہ سُنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا مگر سب لوگ اُس کے پیچھے دوڑے اور چند لمحوں کے اندر اندر پکڑ کر واپس لے آئے۔

"یہ ہے آپ کا مجرم، پرویز!" عنبر نے تھانیدار اور رؤف سے کہا۔ "اب آپ اس کے پاؤں کی پٹّی کھول کر اپنے ہیرے نکال لیں۔ میرا خیال ہے ہیرے پاؤں کی پٹّی کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتے۔"

چند سوال

ہیرے بر آمد ہو گئے۔ پرویز پکڑا گیا۔

غار نے چیخنا بند کر دیا تھا۔

ڈیری فارم پر اسلم صاحب نے سب لوگوں کی ایک زور دار دعوت کی جس کے مہمانِ خصوصی تھے تین سُراغ رساں، عنبر، نسیم اور عاقِب۔

”بیٹے۔“ اسلم صاحب نے سُراغ رسانوں کو داد دینے کے بعد کہا۔ ”میں تم سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

”کہیے۔“

”ایک تو یہ کہ غار کیوں چیختا تھا؟“

”اس لیے کہ جبّار اور تبریزی نے غار کا ایک بند راستہ کھول دیا تھا، جس کے آگے وہ ہیروں کی تلاش میں کھُدائی کر رہے تھے۔ جب کوئی آدمی غار میں داخل ہوتا تو تبریزی، جبّار اُوپر پہاڑی پر خفیہ راستے کے پاس بیٹھا ہوا نگرانی کرتا رہتا تھا، خفیہ اشارہ کر دیا تھا، جس سے غار میں گھنٹی بجنے لگتی اور جبّار، کھُدائی چھوڑ کر راستہ بند کر کے چلا جاتا۔ اس طرح ہوا کی آمد و رفت سے جو چیخوں کی آوازیں پیدا ہوتی تھیں وہ بند ہو جاتی تھیں۔“

”دوسری بات یہ کہ تم لوگ سڑک سے نیچے گِرے تھے تو تم نے رؤف کو نیچے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اُس نے تمہاری مدد کیوں نہ کی؟“

”میں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔“ رؤف نے جواب دیا۔ ”اگر میں اِن کی مدد کرتا تو پرویز بھی مجھے دیکھ لیتا۔ وہ کسی بھی روپ میں ڈیری فارم پر ہو سکتا تھا اور میں اس سے چھُپ کر اُس کے

بارے میں جاننا چاہتا تھا۔"

"ایک سوال یہ ہے کہ عنبر نے یہ کیسے جانا کہ پروفیسر دُرّانی ہی پرویز ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔" عنبر نے کہا۔ "پروفیسر دُرّانی پر مجھے پہلا شک اس وقت ہوا تھا جب وہ غار میں ہمیں شیرے ڈاکو کے روپ میں ملا تھا۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر بات کر رہا تھا۔ میں جبھی سمجھ گیا تھا کہ نقلی شیرا ہماری جان پہچان کے آدمیوں میں سے ہی کوئی آدمی ہے۔"

"اور پھر ہمیں غار میں اصلی شیرے ڈاکو کی لاش کا ڈھانچا بھی مل گیا تھا۔" نسیم نے کہا۔

"البتّہ مجھے یہ بات اُس وقت نہ سوجھی تھی کہ نقلی شیرا پروفیسر دُرّانی ہے۔ مجھے حفیظ پر شُبہ ہوا تھا کیوں کہ اِس نے ہمیں شیرے ڈاکو اور بڑے میاں کی باتیں سُنا کر دہشت زدہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن جب جبّار کی جھونپڑی میں ہمیں سیاہ کپڑوں والے آدمی نے باندھا تو مجھے محسوس ہوا کہ پرویز، جس کا

قصّہ رؤف صاحب نے ہمیں سُنایا تھا، اگر ڈیری فارم پر ہے تو وہ صرف اور صرف پروفیسر دُرّانی ہو سکتا ہے۔"

"مگر۔۔۔۔۔"

"دراصل اُسے یہاں سب لوگ پروفیسر دُرّانی کے روپ میں جانتے تھے، لیکن اُس نے کراچی کی نمبر پلیٹ والی ایک کار پہاڑیوں میں کسی جگہ چھپا رکھی تھی، جس میں شیرے ڈاکو کے میک اپ کا سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ راتوں کو شیرے ڈاکو کے بھیس میں لوگوں کو نظر آتا تھا اور لوگ خوف زدہ ہو جاتے۔ وہ چاہتا تھا کہ جب تک جبّار اور تبریزی تمام ہیرے نہیں نکال لیتے اور وہ اُن سے اُنہیں حاصل نہیں کر لیتا، تب تک لوگ شیرے ڈاکو کے غار کے اندر نہ جائیں۔ ایک بات اور۔ اصلی شیرے ڈاکو کے ڈھانچے کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا اور پروفیسر دُرّانی کے بائیں ہاتھ میں۔ شیرے ڈاکو کے متعلّق کہانیوں اور تصویروں سے بھی اِس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اُس کے دائیں ہاتھ میں پستول ہوتا تھا۔"

دعوت جاری تھی۔ اسلم صاحب عنبر سے برابر سوال کیے جا رہے تھے اور وہ اُن کے جواب دیے جا رہا تھا۔ اچانک ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

"یہاں کوئی رؤف صاحب ہیں؟" اس نے ایک لفافہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اُن کا تار آیا ہے۔"

رؤف صاحب نے شکریہ ادا کر کے تار لے لیا اور پھر پڑھ کر تین سُراغ رسانوں کی طرف لپکا۔ "تم لوگوں کو بیمہ کمپنی نے ایک ایک ہزار روپے انعام دیا ہے۔"

"تو گویا اگلی دعوت ان سُراغ رسانوں کے گھر میں ہو گی اور ہم سب اس میں مدعو ہوں گے۔" اسلم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

دعوت میں شریک سب لوگ ہنسنے لگے۔

ختم شد